نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

گوشے میں قفس کے

دلیپ سنگھ

نئی آواز۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اپنے بھائیوں کے نام

جو میرے بہترین دوست ہیں
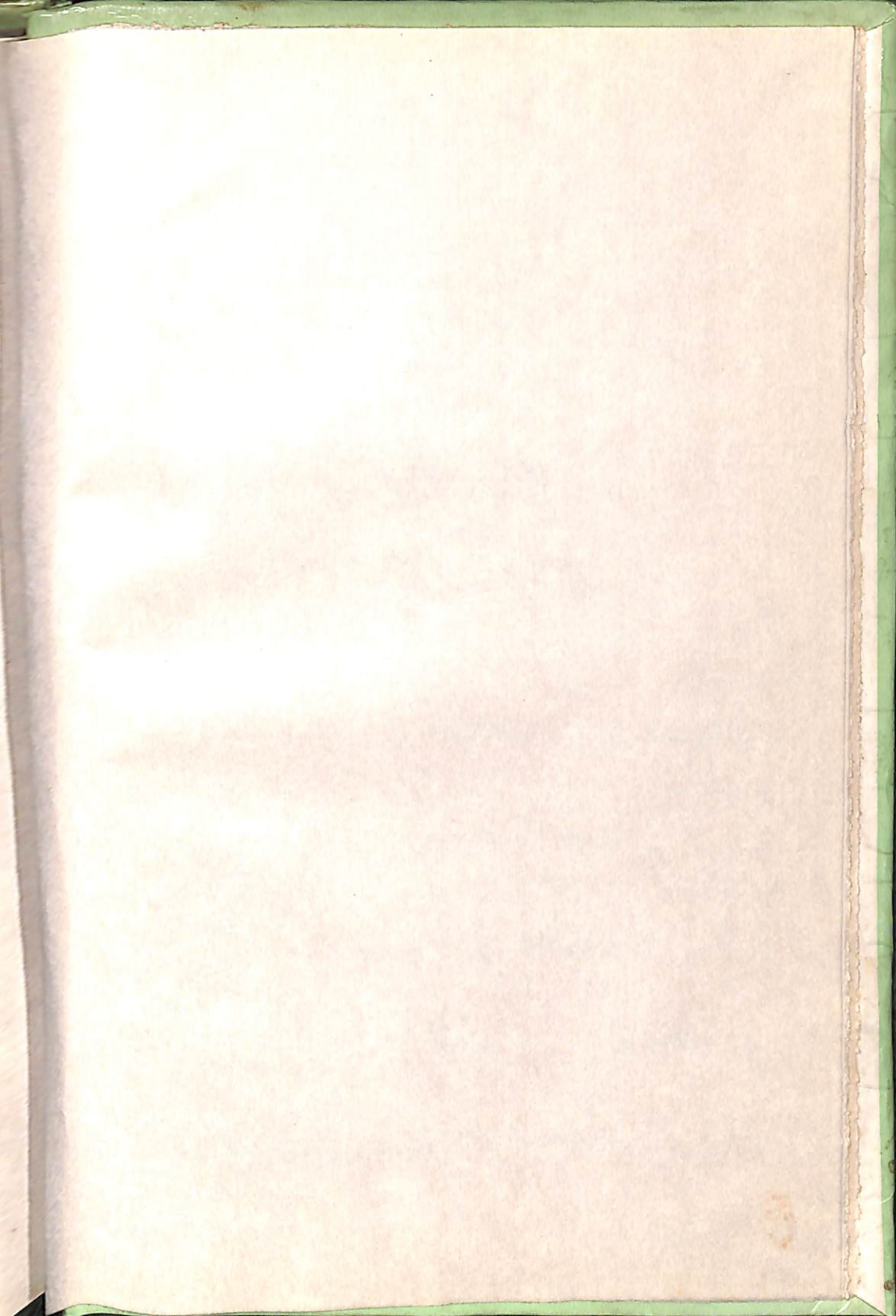
گزارش احوال واقعی

میرے طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔

میرا پہلا مجموعہ "سارے جہاں کا درد" جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس کے فوراً بعد مکتبہ جامعہ کے جناب شاہد علی خاں صاحب نے میری کتاب شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی تو مجھے محسوس ہوا کہ شاید اتنی جلدی ممکن نہ ہوسکے۔ لیکن اپنی ایک دیرینہ کمزوری کی وجہ سے میں نے فوراً ہاں کردی۔ کمزوری یہ ہے کہ میں کسی اچھی دعوت سے انکار نہیں کرتا۔

"ہاں" کرنے کے بعد مجھے صرف دو کام کرنے تھے۔ ایک تو شاہد علی خاں صاحب کو باتوں میں لگائے رکھنا اور دوسرا مضامین لکھتے رہنا۔ پہلا مسئلہ تو اس طرح حل ہوگیا کہ عام طور پر وہ خود اتنے مصروف رہتے ہیں کہ اُنھیں اپنی طرف سے غافل رکھنا بہت مشکل نہیں تھا۔ رہا دوسرا مسئلہ یعنی مضامین لکھنا تو وہ تو خود مجھے ہی حل کرنا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اِس میں بھی کئی لوگ میرا ہاتھ بٹانے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ میں خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا بھائی گردھاری کا جس نے مجھے ایک نئی طرح کی روزگار یوجنا سے متعارف کرایا۔ میں شکرگزار ہوں جناب چرنجی لال صاحب کا جن کی موت کی وجہ سے ہماری سوسائٹی میں ایک خلا تو پیدا ہوگیا لیکن وہ جاتے جاتے میری کتاب کے کچھ

صفحے بھر گئے۔ جناب نور دین صاحب کی لاش کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے کہ اُس نے مجھے انسانی زندگی کے کئی ایسے پہلوؤں سے روشناس کرایا جن سے میں واقف تو تھا لیکن اتنی گہری آشنائی نہیں تھی اور میں شکر گزار ہوں اپنی دونوں بیٹیوں کا کہ جن کی پیدائش کے بعد ہی اچھی طرح میری سمجھ میں آیا کہ لڑکی کا باپ کیا ہوتا ہے۔ باقی حضرات جنھوں نے مجھ پر کرم فرمائی کی، اُن سے میرے قارئین کی ملاقات اِن کتاب کے صفحات میں ہو جائے گی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ طنز نگار زندگی کی ناہمواریوں کی نشان دہی کرتا ہے سچ پوچھیے تو وہ مرہونِ منّت ہے انہی ناہمواریوں کا اور اِن ناہمواریوں کے خالقوں کا کہ اگر وہ نہ ہوتیں اور وہ نہ ہوتے تو طنز نگار کا کاروبار ہی ٹھپ ہو جاتا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ مطلب پرست سیاست داں، رشوت خور سرکاری ملازم اور بے ایمان دکاندار پھلتے پھولتے رہیں کہ ان ہی کے دم خم سے ہمارا دم خم ہے۔

اِس کتاب میں شامل مضامین اردو کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہر مضمون کی اشاعت کے بعد مجھے بہت سے خطوط ملے جن میں اِن مضامین کی تعریف تھی۔ اِن خطوط کو لکھنے والے عام قاری تھے، وہ قاری جو رسالہ خرید کر پڑھتے ہیں اور پھر ادیبوں کو خط لکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے قارئین کبھی ادیب کو یہ نہیں کہتے کہ اگر تعریفی خط چاہیے تو ٹکٹ لگا ہوا لفافہ بھیجو۔ میں اُن تمام قارئین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ میں یہاں اُن کے نام نہیں لکھ رہا لیکن یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اُن کے خطوط مجھے اُسی طرح عزیز ہیں جیسے یہ مضامین۔

اِس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی ذمّے داری میرے محترم دوست جناب ظ۔ انصاری صاحب نے اپنے ذمّے لی تھی۔ وہ جب ماسکو تشریف لے گئے تو اُن کے سامان میں میری کتاب کا مسودہ بھی تھا افسوس کہ وہاں زندگی اُن سے روٹھ گئی۔ لیکن وہ مردِ اخلاق جاتے جاتے بھی ایک طرح سے اپنا وعدہ پورا کر گیا۔ انتہائی اذیت کی حالت میں انھوں نے مجھے ایک شفقت بھرا خط لکھا تھا جس میں میری تحریروں کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے بھی لکھ دی تھی۔ اُن کے خط کا وہ حصّہ قارئین کی نذر ہے۔

"آپ کی تحریر میں جو بے تکلفی ہے، قدرتی پن ہے، زیرِ لب تبسّم بھی گویا اوروں کی خاطر۔ مزاح کے اندر سے ہلکی سی لکیر طنز کی پھوٹتی ہے اور سیچویشن کے سادہ بیان میں جو پٹ آپ سرسوں کی ملا دیتے ہیں۔ ان صفات کی بدولت آپ کے ہاں نہ صرف تازگی، مٹی کی سوندھی مہک اور پنجاب کے آب و نمک کا مزا ملتا ہے بلکہ یہ مزا اوروں سے، میرا مطلب ہے کہ ہم قلم عزیزوں سے جُدا بھی کرتا ہے۔

آپ بیشتر لکھنے والوں خصوصاً بیش از بیش قلم قاروں سے الگ پہچانے اور مانے جائیں گے۔

میں تفصیل سے لکھنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ ۲۰ کو بمبئی اپنے گھر پہنچ جاؤں گا (منزلِ آخر دور نہیں) والسلام"

۵۹ راجندر نگر، نئی دہلی ۶۰

دلیپ سنگھ

دسمبر ۱۳/۱۹۹۱ء

فہرست

حادثہ

یہ کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔
میں گھر سے ایرپورٹ جا رہا تھا۔ تیار ہونے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ اس لیے کار تیز چلا رہا تھا۔ چوک پر ٹریفک لائٹ میرے خلاف تھی لیکن چونکہ دوسری طرف سے کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ رُکتا تو اور لیٹ ہو جاتا۔ میں جانتا ہوں کہ یورپ اور امریکہ میں لوگ آدھی رات کو بھی جب سڑکوں پر کوئی ٹریفک نہیں ہوتا۔ لال بتی دیکھ کر رک جاتے ہیں لیکن میں اُن کی طرح ابھی تک مشین میں تبدیل نہیں ہوا۔ میں جانتا ہوں کہ قانون پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے لیکن قانون کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی اپنی سمجھ بوجھ کا تیاگ کر دے۔ چنانچہ ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کی طرح میں نے کار کو آگے بڑھا دیا۔
دوسری طرف سے یہ سائیکل سوار پتہ نہیں کب میرے سامنے آ گیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اُسے میری کار نظر نہ آئی ہو۔ کل کتنی امپورٹیڈ کاریں ہیں دلی میں؟ اگر وہ عقل و فراست سے کام لیتا تو میری کار کے گزر جانے تک رُکا رہتا۔ آخر اُسے جلدی کیا تھی؟ ایسی ہی اگر جلدی تھی تو سائیکل کی بجائے کسی تیز رفتار سواری پر سفر کرتا۔ اُس نے شاید سمجھ لیا کہ بتی چونکہ اس سمت میں ہے اس لیے اُسے کار کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا تو اُسے سوچنا چاہیے تھا کہ کار اور سائیکل کے لیے قانون ایک سا نہیں ہوتا۔ جمہوریت کا مطلب یہ تو نہیں کہ گدھے اور گھوڑے میں کوئی فرق ہی نہیں رہ جاتا۔
کار کا سائیکل سے ٹکرا جانا ایک فطری عمل تھا۔ اِس ٹکر میں نقصان سائیکل والے کا ہوگا یہ بھی طے تھا۔ یہ البتہ حیرانی کی بات تھی کہ سائیکل سوار ایک دم مر جائے گا۔ ایکسیڈنٹ

ہمارے بھی ہوئے ہیں زندگی میں لیکن مرے تو ایک بار بھی نہیں۔ کبھی انگلی پر خراش آگئی، کبھی پانو پر زخم آگیا، بس۔ لیکن یہ نچلے درجے کے لوگ جب سڑک پر آتے ہیں تو سر پر کفن باندھ کر آتے ہیں اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ان کے نہ رہنے سے ان کے بال بچوں کا کیا ہوگا۔ ویسے دیکھا جائے تو ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے بال بچوں کے لیے کیا کر رہے ہیں سوائے انھیں پیدا کرنے کے۔ جیسی روکھی سوکھی وہ کھلا رہے ہیں ویسی روکھی سوکھی تو اُن کے بچوں کو بعد میں بھی ملتی رہتی ہے۔ بھیک مانگ کر ہی سہی۔

اگر میں جلدی میں نہ ہوتا تو رک کر دیکھتا ضرور کہ سائیکل سوار زندہ ہے یا مر گیا لیکن مجھے تو فوراً ایر پورٹ پہنچنا تھا۔ ایک بڑا افسر بمبئی سے آرہا تھا۔ میں اگر اس کے استقبال کو نہ پہنچتا تو وہ شاید دیا ہوا ٹھیکہ مجھ سے واپس لے لیتا اور اس طرح میرا لاکھوں کا نقصان ہو جاتا۔

ایر پورٹ سے واپسی پر میں اسی سڑک سے گزرا یہ دیکھنے کے لیے کہ سائیکل سوار نے کوئی ہنگامہ تو کھڑا نہیں کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تب تک سائیکل اور سائیکل والا سڑک سے غائب تھے۔

گھر پہنچا تو میرے دوست مرزا وحیدالدین میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ میں نے سارا قصّہ انھیں سنایا تو فکر مند ہو کر پوچھنے لگے "کار کا کوئی نقصان تو نہیں ہوا" میں نے کہا "نہیں"۔ کہنے لگے "شکر ہے بھیّا۔ آپ تو جانتے ہیں امپورٹیڈ کار کی مرمت کتنی مہنگی ہوتی ہے۔"

چائے کے ایک دو پیالوں کے بعد ہم تقریباً اس واقعے کو بھول گئے۔

لیکن دو دن کے بعد اچانک یہ واقعہ پھر سے زندہ ہو گیا۔ پولیس کا ایک حوالدار میرے گھر آیا اور کہنے لگا۔ "آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا"۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" کہنے لگا "آپ نے ایک آدمی کی جان لی ہے"۔ لگتا ہے اس ویران سڑک پر کسی بیکار آدمی نے میری کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

اتنے میں مرزا اچانک نمودار ہوگئے۔ کہنے لگے: "حوالدار! کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ وہ آدمی انہی کی کار کے نیچے آکر مرا"۔

"آپ تھانے چلیے، میں ثبوت بھی دکھا دوں گا" حوالدار نے جواب دیا۔

مرزا نے جب دیکھا کہ رعب سے دال نہیں گل رہی ہے تو قدرے نرم ہو کر بولے:
"بھیّا یہ ایک بہت بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ تھانے اور کچہریوں کے چکر لگانا ان کی شان کے شایاں نہیں۔"
"لیکن صاحب ایک آدمی کی جان چلی گئی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن انھیں کورٹ کچہری میں گھسیٹنے سے وہ زندہ تو نہیں ہو جائے گا آپ کو تو معلوم ہو گا مرزا غالب نے کہا کہ ؎

موت کا ایک دن معیّن ہے

حوالدار نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ غالب نے کیا کہا ہے لیکن اگر اُس کے بیان سے آپ کو فائدہ ہوتا ہو تو بے شک اُسے کچہری میں بطور گواہ پیش کر دینا۔
ویسے تو ہم اس کی بات سن کر ہنس دیے لیکن ہمیں اپنے دماغوں میں خطرے کی گھنٹی بھی سنائی دی کہ یہ حوالدار کوئی سوشلسٹ قسم کا آدمی لگتا ہے۔
لیکن آدمی لاکھ سوشلسٹ ہو، اُسے بھوک تو لگتی ہے۔ بیٹی کی شادی پر اُسے جہیز بھی دینا پڑتا ہے اور اپنی ماں یا باپ کے مرنے پر کریا کی رسم پر دو چار ہزار روپے اُگلنے بھی پڑتے ہیں۔ میں نے اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا۔
"حوالدار جی، سچی بات یہ ہے کہ میں سراسر غلطی پر ہوں۔ واقعی وہ آدمی میری کار کے نیچے آ کر مرا ہے۔ میں اس غلطی کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن آپ کی کچہری میں۔ اِس سے اوپر نہیں جاؤں گا۔"
حوالدار پولیس کی نوکری کئی سال سے کر رہا تھا۔ میری بات سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کہنے لگا: "دس ہزار"۔
مرزا کے سینے میں جیسے کسی نے گولی داغ دی ہو۔ ایک دم بلبلا کر بولے "آپ کا مطلب ہے دس ہزار روپے"۔ حوالدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "جناب رشوت تو روپوں میں ہی لی جاتی ہے، اٹھنیوں، چونیوں میں نہیں۔"
"آپ تشریف لے جائیے، ہم ایک پیسا نہیں دیں گے۔ آپ نے ہمیں اُلّو سمجھ رکھا ہے۔" مرزا چلّایا۔
حوالدار اُٹھ کر چل دیا۔

اُس کے جانے کے بعد کمرے میں کچھ دیر مکمل خاموشی رہی میں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا: "مرزا کچھ بھاؤ تاؤ کرلینا تھا یار ______ خواہ مخواہ بات کو بڑھانے سے کیا حاصل ہے"۔

"ہماری اسی گھبراہٹ سے تو وہ اکڑ گیا" مرزا بولے۔ "ذرا دیکھیں تو سہی وہ کرتا کیا ہے۔ دس ہزار روپے بہت ہوتے ہیں بھیا"۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے کچہری سے سمن آیا کہ مجھ پر ایک کیس درج ہے۔ مرزا نے سمن دیکھتے ہی اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس طرح کے دو تین سمن اور پھاڑنے کے بعد ایک دن میری گرفتاری کا نوٹس آگیا۔ مرزا نے دیکھتے ہی کہا: "اب آئے گا مزا"

"آپ کو تو مزا آئے گا۔ لیکن میں شاید آپ کی خوشی میں شامل نہ ہوسکوں کیونکہ میں تو اُس وقت حوالات میں ہوں گا" میں نے کہا۔

مرزا کہنے لگے آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ میں نے سارا بندوبست کردیا ہے۔

اگلا دن میری گرفتاری کا دن تھا۔ صبح جب میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو کوئی تین ایک سو مرد اور عورتیں میرے گھر کو گھیرے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر بعد مرزا بھی آگئے میں نے پوچھا: "یہ سب کیا ہے"۔

کہنے لگے: "کل تین ہزار کا خرچہ ہے۔ دس دس روپے فی کس کے حساب سے"۔

میں نے کہا وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ لوگ کون ہیں اور کیا کریں گے؟۔

مرزا کہنے لگے: "یہ آپ کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے"۔

بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اتنے میں پولیس آپہنچی اور میں نے دیکھا کہ دس دس روپے والے ان لوگوں نے پولیس کی جیپ کو گھیرے میں لیکر کہا: "ہم نیتا جی کو گرفتار نہیں ہونے دیں گے۔ پولیس نے آنسو گیس چھوڑی لیکن ان میں سے کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ لاٹھی چارج بھی کیا لیکن یہ لوگ ہنس کر لاٹھیاں کھاتے رہے۔ مرزا نے ان کے ساتھ طے یہ کر رکھا تھا کہ پیسے پولیس کے چلے جانے کے بعد ملیں گے۔

اگلے دن اخباروں میں ہنگامہ مچ گیا کہ کس طرح لوگوں نے اپنے ایک محبوب نیتا کو جھوٹی گرفتاری سے بچایا پولیس کی زیادتی کا ذکر کافی تفصیل میں تھا۔ مرزا کا انٹرویو بھی چھپا تھا کہ پولیس نے مجھ پر یہ کیس میرے دشمنوں کے ایما پر بنایا تھا۔ وہ لوگ اس کیس کی آڑ

میں مجھ سے بدلے رہے تھے۔ میری کار تو اُس راہ پر اُس دن چھوڑ کبھی گزری ہی نہیں کیونکہ اگر اُس رستے سے میں کام پر جاؤں تو لمبا پڑتا ہے اور مجھ جیسا وطن دوست آدمی ایسا کام کیوں کرے گا جس میں پٹرول جیسی قیمتی چیز فضول میں ضائع ہو۔

پولیس آتی رہی لیکن مجھ سے محبت کرنے والے یہ تین سو لوگ میرے اور اپنی دال روٹی کے محافظ بن گئے۔ پولیس مجھے تو کیا، میرے گھر کی دیوار کو چھو بھی نہ سکی۔ خرچہ تو اس کھیل میں زیادہ ہو رہا تھا لیکن اب میں بھی اس میں مزا لینے لگا تھا۔ میری تصویر ہر روز اخباروں میں شائع ہونے لگی۔ علاقے میں میری ہر دل عزیزی کے چرچے ہونے لگے۔ اس طرح کی خبریں اخباروں میں شائع ہونے لگیں کہ آج تک میری کار کے نیچے ایک آدمی تو کیا، ایک چیونٹی بھی نہیں مری۔ یہ بھی لکھا گیا کہ پولیس نے رشوت کھا کر مجھے میرے دشمنوں کے ایما پر ایک جھوٹے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ ایک اخبار میں تو یہ بھی لکھا تھا کہ پچھلے ایک سال میں کوئی سائیکل سوار کسی کار کے نیچے آ کر مرا ہی نہیں۔

پولیس کے افسروں نے جب دیکھا کہ لوگ ان پر انگلیاں اٹھانے لگے ہیں تو اُن کا جوش وخروش ٹھنڈا پڑنے لگا۔ کچھ دنوں بعد خود مجھے یقین ہو گیا کہ میری کار کے نیچے آ کر کسی شخص کی جان نہیں گئی۔

اسی عرصے میں مجھ میں ایک اور تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔ میں نے سوٹ کی بجائے کھدر کا کرتا پاجامہ پہننا شروع کر دیا۔ کہیں دس پندرہ آدمی کھڑے دیکھتا تو اپنے آپ میرے ہاتھ نمسکار کی شکل میں جڑ جاتے۔ لوگ مجھے نیتاجی کہنے لگے اور میں نے بُرا ماننے کے بجائے خوش ہونا شروع کر دیا۔

قریب دس دن پہلے مجھ سے پولیٹکل پارٹی کا ایک نمائندہ ملنے آیا اور کہنے لگا: "نیتاجی کیا اگلے چناؤ میں آپ ہماری پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا پسند کریں گے"۔

میں نے مرزا سے مشورہ کرنے کے لیے وقت مانگا۔ مرزا کہنے لگے جواب دینے کی ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ باقی پارٹیوں سے بھی بات کر لیں شاید کوئی بہتر آفر مل جائے۔

میں نے کہا مرزا میری ٹھیکیداری کا کیا بنے گا۔ کہنے لگے: "بھولے آدمی تو سڑکوں کی تعمیر کے کام کو دیش کی تعمیر سے زیادہ ضروری کام سمجھتا ہے"۔

میں نے لاجواب ہو کر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

کہ اب عشق کے امتحاں ختم ہیں

میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے کالج میگزین کے لیے کچھ غزلیں لکھیں۔ انھیں پڑھنے کے بعد میرا ایک ہم جماعت دوست مجھے کالج کے ایک ویران گوشے میں لے گیا اور رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگا "سچ بتانا یار تم غزل کیسے لکھ لیتے ہو" میں کہنے ہی والا تھا کہ پہلے ایک کاغذ پر قافیے لکھ لیتا ہوں جیسے گاتے گئے لاتے گئے۔ کھاتے گئے، نہاتے گئے وغیرہ اور پھر اُن پر شعر کا مضمون فٹ کر دیتا ہوں۔ جس کا تعین دوسرے شعرا پہلے سے کر چکے ہیں۔ جیسے کہ معشوق کی کمر نہیں ہوتی۔ رقیب کے چہرے کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ عاشق غم کھاتا ہے اور وقت گزاری کے لیے اختر شماری کرتا ہے۔ دنیا رہنے کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے اور آسمان ظلم ڈھانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ شراب پینا اچھا کام ہے اور واعظ کو گالیاں دینا اُس سے بھی اچھا۔ اتنا سامان پاس ہو تو غزل گوئی کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن میرے ہم جماعت دوست نے جس طرح ویرانے میں لے جا کر مجھ سے سوال کیا تھا مجھے لگا کہ اُس کے سوال کا اتنا سیدھا جواب کچھ موزوں نہیں لگے گا۔ سوال ایک پُر اسرار انداز میں کیا گیا تھا۔ اُس کا جواب اتنا سیدھا اور عام فہم نہیں ہونا چاہیے۔

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ایک ممتحن جب امتحان کے پرچے میں سوال پوچھتا ہے کہ اکبر نے پیدا ہوتے ہی اپنی ماں سے کیا کہا تھا تو جواب میں یہ لکھنا کہ "اُس وقت وہ بولنے کے قابل نہیں تھا، فقط رو دیا تھا" غیر مناسب سمجھا جائے گا۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکبر جسے بعد میں اکبر اعظم بننا تھا۔ پیدا ہوتے ہی رو دیا ہو۔

اس نے ضرور کوئی پتے کی بات کہی ہوگی ورنہ ممتحن پوچھتا ہی کیوں؟

اِس بات کو ذہن میں رکھ کر میں نے سوچا کہ جواب دینے سے پہلے سوال کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ پہلے اپنے سوال کا پس منظر واضح کرو۔

میرا دوست کہنے لگا کہ دیکھو ہر غزل میں عشق و محبّت اور راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ باتیں بغیر عشق کیے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ جس نے عشق نہیں کیا وہ شاعری نہیں کر سکتا۔ اور تم جب شاعری کر رہے ہو تو ظاہر ہے عشق بھی کر رہے ہو۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کس سے کر رہے ہو۔

اچھا تو یہ بات تھی! اب مجھے محسوس ہوا کہ میرے دوست کا سوال کوئی آسان سوال نہیں ہے۔ اگر کہتا ہوں کہ عشق نہیں کر رہا تو شاعری جھوٹی اور اگر کہتا ہوں کہ کر رہا ہوں تو میں جھوٹا۔ ایک منٹ کے لئے میرے دماغ میں یہ دونوں جواب گتھم گتھا ہوتے رہے۔ آخر میں مَیں نے فیصلہ کیا کہ شاعری پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ کیوں کہ یہ صرف اکیلے میری عزت کا سوال نہیں تھا، پوری شاعر برادری کی عزت کا سوال تھا۔ میں نے چہرے پر مناسب کیفیت پیدا کی اور شرما کر کہا کہ ہاں یار عشق کر رہا ہوں۔ اس نے پوچھا "کس سے"؟

یہ سوال مجھے ذرا سا مشکل لگا۔ چنانچہ مَیں نے ایک جہاندیدہ منسٹر کی طرح جواب دیا کہ اِس سوال کا جواب چونکہ کچھ دوسرے لوگوں کے لیے پیچیدگیاں پیدا کر دے گا اس لیے فی الحال اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔ ہاں یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اِس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ شاید اس میں چھے مہینے لگ جائیں۔

اِس وعدے کے بعد ضروری ہو گیا کہ میں چھے مہینوں کے اندر اندر کسی کی زلفوں کا اسیر ہو جاؤں۔ کسی کے دل میں جا کر بس جاؤں۔ کسی کے خوابوں میں آنے جانے لگوں لیکن سوال یہ تھا کہ کس کے؟ میں تو اسیر ہونے کو تیار تھا لیکن کسی کی زلفیں ہتھکڑی بننے کو تیار ہوں، تب نا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میری پریشانی بڑھنے لگی۔ اگر چھے مہینوں کے اندر اندر عشق نہ کر سکا تو میرا کیا ہوگا۔ یہ بات میرے ذہن سے کوسوں دور تھی کہ جلدی سے کسی محبوب سے میرا وصال ہو۔ میں تو صرف عشق کی کیفیت سے دوچار ہونا چاہتا تھا۔ وہ کیفیت جس میں جسم سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے اور عاشق کپڑے پھاڑ کر جنگل بیابان کی طرف نکل جاتا ہے۔ عشق تو پھر اُسی کو کہتے ہیں۔ اگر وصل اچھی چیز ہوتی تو علامہ اقبال جدائی کی گھڑیوں کو دیر پا کیوں سمجھتے۔

خدا خدا کر کے ایک موقع ہاتھ آیا جس میں عشق کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ مجھے ایک لڑکی کو پڑھانے کے لیے ٹیوٹر کی نوکری مل گئی۔

اِس لڑکی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے تمام مرد دولت کی تلاش میں دربدر کی خاک چھان رہے تھے۔ ویسے تو وہ لوگ آئے دن لندن پیرس اور نیویارک کے دورے کرتے تھے، جہاں آپ خاک چھاننا بھی چاہیں تو خاک نہ ملے لیکن اردو زبان میں کوئی اور مناسب محاورہ نہ ہونے کی وجہ سے میں نے "دربدر کی خاک چھاننا" لکھ دیا ہے۔ گھر کی عورتیں جن کی مجموعی تعداد تین تھی، مردوں کی کمی کو بُری طرح محسوس کرتی تھیں۔ تین میں سے دو عورتیں گھر کے دو مردوں کی جو سگے بھائی تھے، بیویاں تھیں۔ تیسری اُن مردوں کی جواں بہن تھی جو ابھی کنواری تھی۔ میں اُسی کا ٹیوٹر تھا۔

پہلے ہی دن مجھے لڑکی کے ساتھ اکیلا بٹھا دیا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس سے بہتر موقع عشق کا شاید زندگی بھر نہ ملے۔ یہ صحیح ہے کہ لڑکی کی زلفوں میں وہ پیچ و خم نہیں تھے جن کی اسیری میں ایک عجیب سی مسرّت کا احساس ہوتا ہے۔ نہ ہی اُس کی آنکھوں میں وہ خمار تھا جس کا نشہ بلیک لیبل وہسکی کو مات دیتا ہے۔ لیکن اور کئی ایسی صلاحیتیں تھیں جو عشق کے لیے مناسب تھیں۔ مثلاً وہ امیر گھر کی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب میں حرفِ عشق زبان پر لاؤں گا تو میرا دھتکارا جانا لازم تھا۔ اس کے بعد تو پھر میں وہ سب کچھ کر سکتا تھا جو عشق کے لیے لازم سمجھا جاتا ہے۔ جیسے دامن کو تار تار کرنا (اپنے کو)۔ ہجر کے رونے رونا وغیرہ۔ ایک ضمنی پریشانی یہ تھی کہ شاید عشق کے اِس چکر میں میری نوکری چلی جائے لیکن

پھر خیال آیا کہ عشق میں تو لوگ زندگی قربان کر دیتے ہیں، نوکری تو کسی گنتی میں نہیں آتی۔

میں نے وقت برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسرے ہی دن اپنے عشقیہ جذبات کا اظہار اُس سے کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے مجھے انگریزی میں گالیاں دے گی اور پھر بھائیوں کو بلوا کر مجھے گھر سے باہر کر دے گی۔ لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب اس نے میرا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔
میں دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بھائیوں نے یہ سین دروازے کے اوٹ سے دیکھا لیکن دوسرے ہی دن دونوں بھائیوں نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنا چاہیں گی۔ میں جب باری باری انھیں اپنے سامنے بٹھا کر پڑھانے لگا تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیکر آنکھوں سے لگا لیا۔
میں غالباً اس اجتماعی عشق کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے اگلے دن نہ صرف اُن کے ہاں آنا جانا بند کر دیا بلکہ اُس دن کے بعد کبھی اُس گلی کے قریب بھی نہیں پھٹکا جس میں اُن کا گھر تھا۔
یہ میری عاشقانہ زندگی کا آغاز تھا۔
میرے عشق کی اگلی منزل میری ایک ہم جماعت لڑکی تھی۔ کہیں اُس نے مجھے کہہ دیا کہ اُسے بھی اردو ادب سے محبت ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے موقع بے موقع اُسے اردو کے وہ شعر سنانے شروع کر دیے جو عشق کی سلگتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کرتے آئے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اُسے مجھ میں کچھ ایسی خوبیاں نظر آنے لگی ہیں جو سرے سے مجھ میں ہیں ہی نہیں۔ یعنی اُسے بھی مجھ سے محبّت ہو رہی ہے۔
عشق کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے ایک دن میں ایم۔ اسلم صاحب کے ایک ناول کا تحفہ بغل میں دبا کر اُس کے گھر پہنچ گیا۔ یہ مخصوص تحفہ اس لیے کہ یار لوگوں کا مشورہ تھا کہ ایم۔ اسلم صاحب اظہارِ عشق میں میرے وکیل ثابت ہوں گے۔
جب میں اُس کے گھر پہنچا تو گھر میں ایک فردِ واحد موجود تھا جس کی مونچھیں

اس بات کی غماز تھیں کہ فوج میں نوکری کرتا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ رٹا ہوا سبق مجھے یاد نہ رہا اور میں نے ہکلاتے ہوئے کہا " م.....م..... میں ششی سے ملنے آیا ہوں " اس کے چہرے پر غصے اور کرب کے ملے جلے جذبات نمودار ہوئے اور اس نے تقریباً چیخ کر کہا " ہوں " میں نے فوراً وضاحت کی اور کہا کہ مجھے ششی سے کوئی خاص کام نہیں ہے۔ میں تو اُسے صرف یہ کتاب دینے آیا ہوں۔ بزرگوار کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی لیکن ایک لمحہ کے بعد اُس کے چہرے پر پہلی سی کیفیت پھر پیدا ہوئی اور اُس نے قدرے زیادہ زور سے " ہوں " کہا۔ میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں بھگوان کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں کہ میں یہ کتاب اپنے آپ نہیں لایا۔ ششی نے منگوائی تھی۔ بزرگوار کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے طمانیت کے آثار پیدا ہوئے لیکن پھر پہلی سی کیفیت نمودار ہوئی اور اُس نے زور سے " ہوں " کہا۔

میں اُس " ہوں " کی تاب نہ لا کر جو بھاگا تو گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ گھر پہنچا تو بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

اگلے دن ششی نے بتایا کہ اس کے والد مجھ سے ناراض نہیں تھے ان کے چہرے پر جو بار بار غصے اور کرب کے آثار پیدا ہوتے رہتے تھے اُس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی داڑھ میں شدید درد تھا اُسی درد کی وجہ سے کچھ بول بھی نہ سکے اور نہ ہی میری آؤ بھگت ہی کر سکے۔

اِس وضاحت کے باوجود میں نے اس گلی کا دوبارہ رُخ نہیں کیا۔ جو شخص داڑھ کے درد کے زیرِ اثر اس قدر تڑپ سکتا ہے وہ بیٹی کے عاشق کے ساتھ کیا سلوک کر سکتا ہے، اس بات کے تصوّر نے میرے جذبۂ عشق کو سرد کر دیا۔ بہرحال یہ میری داستانِ عشق کا دوسرا پڑاؤ تھا۔

تیسری بار جب میں نے بحرِ عشق میں گھوڑے دوڑا لیے تو میں عمر کی اُس منزل پر پہنچ چکا تھا جس میں ایک عاشق محبوبہ کو دیکھ کر آہیں بھرنے کے علاوہ محبوبہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی قدرتی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھا سکتا ہے۔ میں مناسب طور پر برسرِ روزگار تھا اور کئی والدین اپنی بیٹیوں کو

اس طرح میرے آگے پیچھے گزارتے رہتے تھے کہ میری اچھی یا بُری نظر اُن پر پڑے۔
اُسی زمانے میں مجھ پر عشق کا تیسرا دورہ پڑا۔ مینا دفتر میں میری کولیگ تھی۔
لوگ ہم دونوں کو ایک مثالی جوڑا کہا کرتے تھے کیوں کہ ہم دونوں کی تنخواہ برابر تھی۔
میں تو چاہتا تھا کہ عشق عشق ہی کی حدوں میں رہے تاکہ میں اردو غزل میں اپنے لیے ایک مناسب مقام پیدا کر لوں لیکن مینا کا خیال تھا کہ ہمارے عشق کا نتیجہ بچوں کی صورت میں نکلے کیوں کہ اس سے بہتر شعر آج تک کوئی کہہ نہیں سکا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ میر و غالب شاعری کے میدان میں جو کام کر گئے ہیں وہ میری شمولیت کے بغیر بھی اچھا خاصا سمجھا جاتا ہے۔
میں نے اُس کے مشورہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا کہ عشق نام ہی سرِ تسلیم خم کرنے کا ہے۔
حالانکہ مینا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے مجھے چار سال ہو چکے تھے پھر بھی اس کا تقاضا تھا کہ میں اس کا ہاتھ باقاعدہ اُس کے والد سے مانگوں۔
تاریخ شاہد ہے کہ عاشق اور محبوبہ کے والد کا جب بھی آمنا سامنا ہوا، نتیجہ عاشق کے حق میں کچھ اچھا نہیں نکلا۔ اس لیے میں مینا کے والد کو ملنے سے ڈرتا تھا۔ لیکن مینا کا خیال تھا کہ یہ ڈر بے بنیاد ہے" وہ زمانے گئے جب والدین بیٹی کے عاشق کو دیکھ کر بندوق نکال لیتے تھے۔ اب تو اُسے ڈھونڈنے کے لیے اخباروں میں اشتہار دیے جاتے ہیں اور پھر تمھارے جیسا داماد۔۔۔۔" میں نے پوچھا مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے۔ کہنے لگی تم جہیز جو نہیں مانگ رہے۔
طے یہ ہوا کہ میں کسی اتوار کو جاکر پروفیسر صاحب کو مل لوں میں شاید یہ بتانا اب تک بھول گیا تھا کہ بزرگوار یونی ورسٹی میں لٹریچر کے پروفیسر تھے۔
میں جب اُن کے گھر پہنچا تو موصوف کتابوں اور مسودوں کے پلندے ایک صندوق میں بھر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کیا وقت پر آئے ہو میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا "سر آپ کو پتہ تھا کہ میں آپ کو ملنے آ رہا ہوں" کہنے لگے "پتہ تو نہیں تھا لیکن مجھے آج تلاش تھی ایک ایسے نوجوان کی جس کے بازوؤں میں دَم ہو جس کے کندھے بوجھ دیکھ کر جھک نہ جائیں" میں ان کی بات سمجھ تو نہ

پاپا لیکن جوش و خروش میں کہہ دیا کہ "سر آپ میرے کندھے میرے بازو دیکھیے۔ یہ اگر کسی بھی بوجھ کے نیچے جھک جائیں تو میں انھیں کاٹ کے پھینک دوں گا"۔

اس زوردار تقریر کے بعد میں نے پوچھا "سر آپ جانتے ہیں ناکہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" کہنے لگے "گدھے تم سمجھتے ہو" میں زندگی بھر کتابیں ہی چاٹتا رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو" لیکن پہلے میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو"۔ میں نے کہا " حکم دیجیے میں آپ کی خاطر جان تک قربان کرنے کو تیار ہوں " کہنے لگے فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف اتنا ہی کام ہے کہ مسودہ سے بھرا ہوا یہ صندوق میں اوپر بیڈ روم میں لے جانا چاہتا ہوں۔ بہت بھاری ہے لے چلو گے؟ میں حیران کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مینا نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا "پاپا آپ انھیں پہچان نہیں رہے کیوں کہ آپ نے عینک نہیں لگا رکھی" کہنے لگے "اس گدھے کو پہچاننے کے لیے کیا عینک کی ضرورت ہے؟ اور تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ بات دو مردوں میں ہو رہی ہے اگر کر سکتی ہو تو اس صندوق کو اس نوجوان کے سر پر رکھنے میں میری مدد کرو"۔

قصہ مختصر وہ صندوق میرے سر پر رکھا گیا۔ صندوق بے انتہا بھاری تھا اور میرے "مضبوط" کندھوں میں سے وہ آوازیں نکل رہی تھیں جو درختوں کی سوکھی ٹہنیوں کے ٹوٹنے کے وقت نکلتی ہیں لیکن میں گرتا پڑتا سیڑھیاں چڑھ گیا جب میرے سر سے صندوق اتارا گیا تو پروفیسر صاحب نے پوچھا "اب بتاؤ کس کتاب میں مدد چاہیے۔ کیا شیکسپیئر سمجھ میں نہیں آ رہا ہے یا ملٹن نے پریشان کر رکھا ہے"۔

اب سمجھ میں آیا کہ پروفیسر مجھے اپنا کوئی نالائق اسٹوڈنٹ سمجھ رہا ہے میرے منہ سے تو خیر بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن مینا نے غصّے سے اپنے پاپا کو بتایا کہ میں کون ہوں۔

بزرگوار پر اب پچھتاوے کا دورہ پڑ گیا۔ کہنے لگا "یہ میں نے کیا کر دیا" اپنے ہونے والے داماد سے بوجھ اٹھوا دیا"۔ میں نے بہتیرا کہا کہ جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن وہ کہے جا رہے تھے کہ جب تک اس گناہ کا کفّارہ نہیں کروں گا۔ میرے دل پر ایک بوجھ رہے گا۔

کچھ دیر سوچ میں غرق رہے اور پھر ایک دم چہک اٹھے "سوچ لیا۔ میرے گناہ کا کفارہ یہی ہے کہ یہ صندوق وہیں لے جایا جائے جہاں سے آیا ہے" میرے اور بینا کے احتجاج کے باوجود انھوں نے وہ صندوق مجھ پر دوبارہ لادا اور مجھے نیچے لے جانے کا حکم دیا۔

جب میں ہانپتا کانپتا نیچے پہنچا اور صندوق میرے سر سے اتروایا گیا تو بزرگوار نے فرمایا کہ میرے دل سے اب بوجھ اتر گیا ہے اب میں بخوشی بینا کا ہاتھ تمھارے ہاتھ میں دے سکتا ہوں۔

صندوق تو خیر میرے سر سے اُتر گیا لیکن بینا کا بوجھ جو میرے کندھوں پر لادا گیا وہ میں پچھلے پچیس سال سے اٹھائے پھر رہا ہوں۔ اسی بوجھ کی وجہ سے مجھ میں یہ سکت بھی نہ رہی کہ کوئی اور عشق کر سکوں۔ ڈاکٹر اقبال کی طرح اب میں یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ ع

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

گردھاری روزگار یوجنا

یہ حیرانی کی بات ہے کہ ہر انسان پیٹ کی آگ کو بجھانا تو ضروری سمجھتا ہے لیکن اس آگ کو بجھانے کے لیے جس تگ و دو کی ضرورت ہے، اُسے مصیبت خیال کرتا ہے۔ اتنا تو اُسے سمجھنا چاہیے کہ اگر بریانی کھانے کو اس کا جی چاہتا ہے تو اس کے لیے اُسے چاول اور گوشت کا بندوبست تو کرنا ہی ہوگا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ نے کہا کہ "بریانی" اور بریانی آپ کے منہ میں داخل ہو گئی۔ لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ شے جسے "روزگار" کہتے ہیں کسی کو پسند نہیں۔ فیض کو جب اپنے محبوب کے پاس سے اٹھ کر کام پر جانا پڑا تو چلا اٹھے کہ ہائے کیوں۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور مرزا غالب تو خیر اُن دنوں کی یاد میں، جب ان کے لیے روزگار کا مسئلہ نہیں تھا، بلک بلک کر روتے ہوئے سنائی دیتے ہیں جب وہ کہتے ہیں:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

شاید اسی لیے بہت سے لوگوں نے "روزگار" کو "غم روزگار" کہنا شروع کر دیا۔

مجھے خوشی ہے کہ کم از کم میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ جب میں کالج سے ڈگری لے کر باہر نکلا تو خود بخود روزگار کی تلاش میں لگ گیا۔ میرے خیال میں فیض وغیرہ کے ساتھ مشکل یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنی زندگی کی ترتیب کو اُتھل پتھل کر دیا۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ پیدا ہو جاؤ، پڑھو لکھو، روزگار ڈھونڈو، محبت کرو، بچے پالو، اور مر جاؤ۔ لیکن انھوں نے "پڑھو لکھو" کے بعد "روزگار ڈھونڈو" کی بجائے "محبت کرو" لگا لیا۔ گویا پہلے ایک آسان کام پر ہاتھ ڈال دیا اس کے بعد "روزگار ڈھونڈو" والا کام تو مشکل لگنا ہی تھا۔

جب میں روزگار کی تلاش میں نکلا تھا تو مجھے ایسا نہیں لگا کہ میں کوئی مہم سر کرنے جا رہا ہوں
مجھے پتا تھا کہ میں کچھ خاص قسم کے کام کر سکتا ہوں اور مجھے صرف اُن لوگوں کو تلاش کرنا تھا
جنھیں میری صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ دیکھیے نا اگر میں نل ٹھیک کرنے کا کام جانتا ہوں
تو مجھے وہیں روزگار تلاش کرنا چاہیے جہاں نل ٹھیک کام نہیں کر رہے۔ یہ تو نہیں کہ
کسی قبرستان میں گھس کر آوازیں لگاتا پھروں کہ نل ٹھیک کرالو۔

چنانچہ جب میں نے ٹھیک جگہ پر آواز لگائی تو مجھے روزگار مل گیا۔ نوکری ملنے کے
بعد مجھے غالب کی طرح یہ تشویش بھی نہ ہوئی کہ اب وہ فرصت کہاں سے لاؤں گا جب بیٹھ
کر تصورِ جاناں کر سکوں گا۔ دفتر دس سے پانچ تک لگتا تھا اور یہ کل سات گھنٹے بنتے ہیں
باقی سترہ گھنٹوں میں نہ صرف جاناں بلکہ اُس کے خاندان کے دیگر افراد کا تصور بھی کیا جا سکتا
تھا۔ کچھ مہینے کام کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تصورِ جاناں تو دفتر کے اوقات میں بھی
کیا جا سکتا ہے۔ یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ میں سرکاری دفتر میں کام کرتا ہوں
یہ البتہ بتانے کی بات ہے کہ دفتر کے اوقات میں تصورِ جاناں کرتے ہوئے میں نے
ترقی بھی پائی ہے۔

اکثر لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ اب وہ والا زمانہ نہیں رہا۔ روزگار ملنا خاصا
مشکل کام ہو گیا ہے۔ لوگ روزگار کی تلاش میں دربدر کی خاک چھان رہے ہیں۔
لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی مشکل کو مدِنظر رکھتے ہوئے سرکار کو "روزگار یوجنا" تیار
کرنی پڑی جس کا کام ہی لوگوں کو روزگار ڈھونڈ کر دینا ہے۔

میں جب یہ سنتا ہوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نے روزگار خود کیوں تلاش کیا۔
سرکار تلاش کر دیتی تو شاید اس سے بہتر روزگار ملتا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ بیوی جو میں نے
خود تلاش کی، اگر یہ بھی سرکار کی مدد سے تلاش کی ہوتی تو شاید اور بہتر مل جاتی لیکن میرے
دوست کہتے ہیں کہ سرکار نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی یوجنا نہیں بنائی۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ روزگار یوجنا بنا کر سرکار لوگوں کو روزگار کیسے
ڈھونڈ دیتی ہے اگر سرکار کے پاس روزگار ہے تو وہ بغیر یوجنا بنائے بھی بے روزگاروں
کو دیا جا سکتا ہے اور اگر نہیں ہے تو یوجنا بنا کر کیسے اُسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟
دیکھیے نا اگر پانی کے نل مرمت کرنے والوں کے لیے روزگار نہیں ہے تو سرکار کے

کے پاس صرف ایک ہی طریقہ ہے انھیں روزگار مہیّا کرنے کا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر اُن کے نل خراب کرے اور پھر ان بے روزگار لوگوں کو نل کی مرمت کے لیے وہاں بھیج دے۔ اگر سرکار ایسا نہیں کر رہی ہے تو پھر کیسی یوجنا اور کہاں کی یوجنا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سرکار کے پاس روزگار ہے لیکن وہ بے روزگاروں میں اس طرح تقسیم کرنا چاہتی ہے کہ وہ زندگی بھر اُس کے احسان مند رہیں۔ اور اس احسان مندی کے تحت اُسی پارٹی کو ووٹ دے کر حکومت کرنے دیں اور اس طرح اُسے (میرا مطلب ہے اُسی پارٹی کو) بے روزگار ہونے سے بچائے رکھیں۔

ایسا لگتا ہے سرکار سے شاید کچھ اور لوگوں نے بھی روزگار یوجنا بنانا سیکھ لیا ہے۔ مجھ پر یہ انکشاف ابھی کچھ مہینے پہلے ہی ہوا۔

میں جس علاقے میں رہتا ہوں اُس کے سامنے ایک سڑک ہے جس پر میں اکثر ایک آدمی کو چہل قدمی کرتے دیکھتا تھا۔ میں نے کبھی اُسے کوئی کام کرتے نہیں دیکھا وہ بس صبح و شام ہمارے مکانوں کے سامنے چکّر لگاتا رہتا تھا۔

ایک دن جب میرا تجسّس حد سے تجاوز کر گیا تو میں نے اُسے بلا کر پوچھا کہ "کیوں بھئی یہاں کیا کر رہے ہو؟" کہنے لگا "ڈیوٹی کر رہا ہوں"

میں نے کہا یہ کیسی ڈیوٹی ہے، تم تو صرف چہل قدمی کر رہے ہو۔

کہنے لگا "آپ سپروائزر کے کام کو ڈیوٹی نہیں سمجھتے"؟

کافی دیر گفتگو کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے ایک روزگار یوجنا چلا رکھی ہے جس کے تحت اس کا کام صرف سپرویژن کرنا ہے میں نے اُس کی یوجنا کو گردھاری روزگار یوجنا کا نام دیا ہے اس کی تفصیلات کچھ اس طرح ہیں۔

گردھاری جب جوان ہوا تو سوائے برتن مانجھنے کے اور کپڑے دھونے کے اُسے کوئی کام نہیں آتا تھا اس نے بہتیری کوشش کی کہ اُسے گھر میں کوئی ملازم رکھ لے لیکن شریف گھروں کی عورتیں نوجوان مردوں کو ملازم نہیں رکھتیں۔ گردھاری سمجھدار آدمی تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ روزی پیدا کرنے کے لیے ایک روزگار یوجنا بنانی ہوگی۔

چنانچہ اس نے شادی کر لی۔ بیوی جب آئی تو اُسے تین چار گھروں میں ملازم کروا دیا برتن مانجھنے پر اور کپڑے دھونے پر۔ اُس کی تنخواہ سے گھر میں چولھا جلنے لگا۔ گردھاری

بس دن بھر اِن گھروں کے باہر چکّر لگاتا رہتا ہے جہاں اُس کی بیوی کام کرتی تھی۔ گردھاری جانتا تھا کہ شریف گھروں کے مرد نوجوان ملازماؤں کو دیکھ کر اکثر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

گردھاری بھی ہم سب کی طرح زندگی میں ترقی کرنے کا شوقین تھا چنانچہ اُس نے کچھ عرصہ بعد ایک اور شادی کرلی۔ محنت کرنے والے آدمی پر خدا اپنی رحمتیں ضرور نازل کرتا ہے گردھاری کی دونوں بیویوں سے ایک ایک لڑکی پیدا ہوئی یہ چاروں اب سولہ گھروں میں ملازمت کرتی ہیں۔ گردھاری کی سپروائزری کی ذمّےداریاں بڑھ گئی ہیں لیکن بغیر محنت کیے گردھاری امیر کیسے بن سکتا تھا؟

گردھاری کا مجھ سے اب اچھا خاصا دوستانہ ہو گیا ہے وہ اکثر مجھ سے مشورہ کرنے آتا ہے کہ اپنی آمدنی کو کون سے بینک میں رکھے۔ کون سی موٹر سائکل خریدے، کس کمپنی کے شیئرز خریدے وغیرہ۔

کل آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ایک ڈبہ تھا۔ مجھے مٹھائی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ کچھ وقت نکال کر آج شام میرے گھر آیئے"

"کیا بات ہے گردھاری" میں نے پوچھا۔

"میں شادی کر رہا ہوں" وہ بولا۔

میں نے گھبرا کر کہا "ایک اور شادی! کیوں گردھاری کیا دو عورتوں سے تیرا دل نہیں بھرا"؟

کہنے لگا "دل بھرنے کی بات نہیں ہے صاحب۔ مہنگائی تو دیکھیے کتنی بڑھ گئی ہے۔ دو عورتوں سے آج کل گزارا کہاں ہوتا ہے"

میں نے دل ہی دل میں سوچا گردھاری کو تو روزگار یوجنا چلانے کے لیے سرکار کا مشیر ہونا چاہیے۔ یقیناً یہ بڑے اونچے دماغ کا آدمی ہے۔

نوردین کی لاش

قارئین کرام! نوردین کی لاش سے آپ کا تعارف کرانے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنا تعارف آپ سے کرا دوں۔ میں بھارت سرکار کے ایک دفتر میں ایک ایسے عہدے پر کام کر رہا ہوں جسے انگریز کے زمانے میں ذمے دار عہدہ کہا جاتا تھا۔ عہدہ تو وہی ہے البتہ ذمہ داری والی بات اب نہیں رہی۔ میرے دفتری فرائض میں جب مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو ذمہ دار میں اپنے ماتحتوں کو ٹھہراتا ہوں اور اگر میرے ہاتھوں کوئی کارنمایاں سرانجام پا جاتا ہے تو اُس کی داد و تحسین میرے افسروں کو ملتی ہے۔

یہ طریقۂ کار میرا ایجاد کیا ہوا نہیں ہے یہ دستور تمام افسروں نے ایک دوسرے کی رضامندی سے اپنایا ہے اور میرا نام بھی چونکہ سرکاری افسروں میں گنا جاتا ہے میں اس دستور سے مبرّا کیسے رہ سکتا تھا؟۔

اس ضروری تعارف کے بعد آئیے اب نوردین کی لاش کی طرف رجوع کریں کہ یہی اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔

آج سے چھے مہینے پہلے نوردین یا اُس کی لاش سے میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ نوردین نہ میرا اسکول میں ہم جماعت تھا، نہ دفتر میں میرا شریک کار۔ اس کے باوجود وہ بلکہ اس کی لاش، میری زندگی میں اِس طرح سے داخل ہوئی جیسے ہم جڑواں بھائی ہوں۔

چھے مہینے پہلے کی بات ہے کسی واقف کار نے مجھے فون کیا کہ اُس کے ایک دوست کا رشتہ دار، نوردین ملازمت کے سلسلے میں جدّہ گیا تھا اور وہیں اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ کیا میں پتا لگا سکتا ہوں کہ اُس کی لاش اس وقت کہاں ہے؟۔

سرکاری افسر کی حیثیت سے میں نے جدہ میں ہندستانی سفارت خانے کو ایک تار داغ دیا: "مجھے فوراً اطلاع دی جائے کہ نور دین کی لاش اس وقت کہاں ہے"۔ کسی مردے کا پتا معلوم کرنے کی زندگی میں یہ میری پہلی کوشش تھی۔

سفارت خانے والے اگر فوراً جواب دے دیتے تو بات وہیں ختم ہو جاتی لیکن انھوں نے تحقیقات میں چھ مہینے لگا دیے۔ میں اس سلسلے میں ان کو الزام نہیں دے سکتا۔ آج کل کے زمانے میں جب زندوں کا پتا لگانے میں مہینوں گزر جاتے ہیں تو مُردوں کی تلاش میں تو وقت لگے گا ہی۔

آپ نے اخبارات میں ایسے اشتہارات اکثر دیکھے ہوں گے جو گمشدہ لوگوں کے بارے میں ہوتے ہیں۔ گم شدہ لوگوں کو تلاش کرنے والوں کو انعام کا لالچ دیا جاتا ہے بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گم شدہ اپنے آپ گھر آجائے تو وہ خود بھی اِس انعام کا حق دار سمجھا جائے گا۔ پھر بھی لوگ سالہا سال گم رہنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

گم شدہ زندہ آدمی تو پھر بھی کبھی نہ کبھی پکڑا جاتا ہے بلکہ جب اُس کے پاس گھر سے چُرا کر لے گئے پیسے ختم ہو جاتے ہیں تو وہ خود ہی ان جگہوں پر جانا شروع کر دیتا ہے جہاں سے وہ آسانی سے پکڑا جا سکے۔ لیکن گم شدہ مردہ اپنے آپ کچھ کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے۔ آپ ہی اسے تلاش کریں تو کریں وہ آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

چھ مہینوں میں میں نور دین کو مکمل طور پر بھول گیا۔ اُس واقف کار کو بھی بھول گیا جس نے مجھے نور دین کی تلاش پر مامور کیا تھا۔ وہ شاید خود بھی بھول چکا تھا کہ نور دین کی لاش کی اُسے تلاش ہے۔

لیکن ایک دن نور دین کی لاش اچانک میرے لیے زندہ ہو گئی۔ مجھے جدّہ میں مقیم ہندستانی سفارت خانے سے تار ملا۔ کہ آج سعودی ایر لائنز کی فلاں فلائٹ سے نور دین کی لاش آرہی ہے۔ ایر پورٹ پر اُس کے استقبال کے لیے پہنچ جائیے گا۔

میں نے حافظے پر بہت زور دیا کہ نور دین کون ہے اور اس کی لاش کے استقبال کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے، لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ خیر چونکہ سرکاری حکم تھا اس لیے گاڑی لے کر ایر پورٹ پہنچ گیا۔

ایرلائنز والوں نے مجھے ایک خوبصورت سا تابوت دکھا کر کہا کہ یہ سامان آپ کا ہے۔ اسے لے جائیے۔ میں جب اس تابوت کو ہاتھ لگانے سے ہچکچایا تو ایرلائنز کے افسر نے تسلی دیتے ہوئے کہا "اگر آپ کو شک ہے تو بیشک تابوت کھول کر دیکھ لیجیے اندر آپ کو اپنا نوردین ہی ملے گا" یعنی نوردین اب میرا اپنا ہو چکا تھا۔

میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید نوردین کا کوئی اصلی وارث نکل آئے لیکن یہ خوش قسمتی کہاں۔ چار و ناچار تابوت کو کار پر لادا اور گھر لے آیا۔

تابوت کو لے کر جب میں گھر میں داخل ہوا تو کچھ پڑوسی بھی چہرے پر دکھ سجائے میرے ساتھ گھر میں آ گئے۔ چار چھے نے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر بھی کر لیا۔ جس کی وجہ سے خود مجھے اور میری بیوی کو بھی رونا پڑا کہ دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ نہ مجھ سے کسی نے پوچھا اور نہ میں نے بتانا ضروری سمجھا کہ تابوت میں لیٹے ہوئے شخص سے میری جان پہچان بھی نہیں ہے۔ اگر یوں کہتا تو پھر اُن کے اگلے سوال کا کیا جواب دیتا کہ لاش میرے گھر میں کیا کر رہی ہے۔

پڑوسی چلے گئے تو میری بیوی نے اپنے آنسو پونچھ کر یہی سوال کیے:

"کیا لگتے ہیں ہم نوردین کے"۔

"یہ ہمارے گھر میں کیا کر رہا ہے"۔

"اسے یہاں سے بھگاتے کیوں نہیں ہو"۔

مردے کو اگر بھگایا جا سکتا تو میں یہ کام اب تک کر چکا ہوتا۔ یہاں تو یہ حالت تھی کہ ہم دونوں تو لڑ رہے تھے اور نوردین آرام سے تابوت میں لیٹا ابدی نیند کے مزے لوٹ رہا ہے۔

اپنے گھر میں فساد کو روکنے کے لیے میں نے نوردین کے تابوت کو ایک بار پھر گاڑی پر لادا اور گھر سے نکل پڑا۔

کئی دوستوں سے درخواست کی لیکن کوئی نوردین کو پناہ دینے کو تیار نہ ہوا۔ مجبوراً ایک ہسپتال میں جا کر درخواست کی کہ جب تک نوردین کے وارث نہیں مل جاتے اُسے اپنے مردہ خانے میں رکھ لیجیے میں اس کا سارا خرچ برداشت کروں گا۔

نوردین کو مردہ خانے میں داخل کرنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے گھر میں جگہ

کی قلت کی وجہ سے میں اپنے کسی خاص مہمان کو ہوٹل میں داخل کرا آیا ہوں۔
اب سوال یہ تھا کہ نور دین کو کتنے دن مردہ خانے میں رکھ سکوں گا اُس کی دس دن کی رہائش کا بل ہی میری تنخواہ پر بھاری ہو گیا۔ آخر کار ایک دوست سے مدد مانگی۔ اس نے تابوت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کہا کہ تابوت بہت عمدہ لکڑی کا ہے اور کم از کم دس ہزار میں بک جائے گا۔ میں نے کہا وہ تو درست ہے لیکن سوال اس وقت یہ ہے کہ نور دین کا کیا کیا جائے۔ اُس نے تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر ایک نظر نور دین کو دیکھا اور کہا کہ پانچ ایک ہزار میں یہ بھی نکل جائے گا۔
اُس کی باتیں سن کر مجھے یوں لگا جیسے نور دین میرے لیے مصیبت نہیں بلکہ رحمت کا فرشتہ بن کر آیا ہو۔
میرے دوست نے کچھ دنوں بعد دونوں چیزوں کا سودا کروا دیا مردہ خانے کا بل چکانے کے بعد میری جیب میں دس ہزار روپے نقد تھے۔
اچانک نور دین ہمیں اپنا ہی لگنے لگا۔ میں نے اور میری بیوی نے فیصلہ کیا کہ ہم ان روپوں سے ایک نیا فریج خریدیں گے اور اس پر جلی حروف میں لکھوائیں گے "نور دین کی طرف سے خلوص کے ساتھ"۔
کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ اگر نور دین کا کوئی رشتہ دار کہیں سے نمودار ہو گیا اور اُس نے لاش کا مطالبہ کیا تو کیا کروں گا۔ میری بیوی کا خیال تھا کہ ہم سے زیادہ قریبی رشتہ دار کہاں سے نمودار ہو گا" کوئی اور تھا جو اسے ایئر پورٹ سے لینے گیا ہو۔ کوئی اور تھا جس نے دس دن کے لیے اس کی رہائش کا انتظام اپنے خرچ پر کیا"۔
چنانچہ ہم نے فریج خرید لیا۔ فریج کا ٹھنڈا پانی پی پی کر ہم نور دین کو دعائیں دیتے تھے۔
ایک دن اچانک ایک شخص میرے گھر آیا اور کہنے لگا۔ "سنا ہے آپ نے میرے بھائی کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں کارِ نمایاں کیا ہے۔ میں اس کارِ خیر کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں"۔
حالانکہ اس نے مجھے چونکا دیا پھر بھی میں نے قدرے سنبھل کر کہا "شکریے کی کیا بات ہے بھائی۔ نور دین کی مدد کرنا میرا انسانی فرض تھا اور پھر اب تو میں اسے اپنوں میں شمار کرتا ہوں۔ ٹھنڈا پانی پئیں گے آپ؟"

"وہ بھی دیوں گا"۔ نور دین کے بھائی نے جواب دیا "لیکن یہ تو بتائیے کہ میرا بھائی کس قبرستان میں دفن ہے"۔

"وہ کسی قبرستان میں نہیں ہے"۔ وہ تو ایک ہسپتال میں سائنس کی تحقیق میں مدد کر رہا ہے"۔

نور دین کا بھائی بظاہر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا "یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میرے بھائی کو موت کے بعد بھی کام پر لگا دیا"۔ پھر ایک آدھ منٹ کی خاموشی کے بعد بولا:

"ہسپتال والے تو شاید اس طرح کے خدمت گزار کا کچھ نذرانہ بھی دیتے ہیں"۔

میں نے کہا "ہاں شاید انھوں نے مجھے بھی کچھ رقم دی تھی"۔ یہ کہتے ہوئے میرے دماغ میں خطرے کی ایک ہلکی سی گھنٹی بجی۔

کچھ دیر بعد نور دین کا بھائی بولا۔

"سنا ہے سعودی عرب سے جب کوئی لاش آتی ہے تو اس کو بہترین لکڑی کے صندوق میں بھیجا جاتا ہے میں چاہتا ہوں اس لکڑی کا صوفہ بنوا کر ہم اسے ڈرائنگ روم میں رکھ دیں تاکہ نور دین کی یاد ہمارے دل سے کبھی محو نہ ہو"۔

نور دین کے بھائی کی بات سن کر ایک لمحہ پہلے میرے دماغ میں جو ہلکی سی گھنٹی بجی تھی اس نے گھڑیال کی صورت اختیار کر لی۔ ایسی حالت میں انسان اکثر جھنجھلا جاتا ہے میں بھی جھنجھلا گیا اور کہا۔

"صاف صاف کہیئے آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"۔

"اب کہنے سننے کو رہ ہی کیا گیا ہے صرف وہ پندرہ ہزار روپے جو آپ نے میری بھائی کی لاش اور تابوت بیچ کر وصول کیے۔ وہ میرے حوالے کیجیے تاکہ میں چلتا بنوں" نور دین کے بھائی نے کہا۔

یہ سنتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے گہری نظر سے نور دین کے بھائی کی صحت کا مطالعہ کیا کہ آیا اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ہے جب کوئی صورت نظر نہ آئی، میں نے با دلِ نخواستہ چیک بک نکال کر پندرہ ہزار کا چیک نور دین کے بھائی کے نام لکھ دیا۔

چیک دے کر مجھے یوں لگا جیسے میرا نور دین سے ناتا ہی ٹوٹ گیا ہو، مجھے لگا جیسے میں

کسی نورِ دین کو نہیں جانتا۔ نہ اُسے کبھی دیکھا ہے نہ کبھی اُس کا نام سنا ہے۔ لیکن نورِ دین کا بھائی چیک جیب میں رکھ کر یوں مسرور نظر آرہا تھا جیسے اپنے بھائی سے گلے مل رہا ہو۔

جُوس کا گلاس

یہ ایک اتوار کی صبح کی بات ہے۔
میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اخبار پڑھ رہا تھا کہ میری نظر ایک ایسی خبر پر پڑی۔ جس نے مجھے چونکا دیا۔ لکھا تھا۔
"اردو کے مشہور شاعر جناب محمد علی شگفتہ نے بھوک ہڑتال کر دی"
عام حالات میں تو مجھے چونکانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ شگفتہ اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ ایک شخص جس کا کل ادبی سرمایہ دس یا پندرہ غزلیں تھیں۔ وہ مشہور کب سے ہو گیا؟ کافی ہاؤس میں میری طرح کے جو دس آدمی اُس کے کلام سے لطف اٹھاتے تھے وہ بھی اُس کے کلام کو سرگوشیوں میں سننا پسند کرتے تھے پھر وہ مشہور کیسے ہو گیا۔ لیکن اس وقت زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ شگفتہ نے بھوک ہڑتال کیوں کی؟
پوری خبر یوں تھی۔
"اردو کے مشہور شاعر جناب محمد علی شگفتہ نے وزیر اعظم کے گھر کے باہر بھوک ہڑتال کر دی ہے۔ ہمارے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب تک ہر ہندستانی نوجوان کو نوکری نہیں ملتی میں بھوک ہڑتال نہیں توڑوں گا۔ چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔
پوری خبر پڑھنے کے بعد معاملہ اور بھی سنگین ہو گیا۔ پہلی وضاحت طلب بات تو یہ تھی کہ ہر ہندستانی نوجوان کو نوکری کیوں چاہیے؟ سب لوگ ملازمت پر چلے جائیں گے تو سبزی کون بیچے گا؟ پان کی دُکان پر کون بیٹھے گا؟ کپڑے کا بیوپار کون کرے گا؟ شگفتہ کیوں چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو بھی ملازمت دلا دے جن کا

اچھا بھلا کاروبار چل رہا ہے۔
لیکن زیادہ وضاحت طلب بات یہ تھی کہ شگفتہ نے زندگی بھر خود کوئی ملازمت نہیں کی تھی۔ ملازمت کیا، کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اِس وقت اُس کی عمر چالیس سال کی تھی گھر سے وہ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ کہہ کر نکلا تھا کہ کام کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ہم لوگوں سے کافی ہاؤس میں ملاقات ہو جانے کے بعد اُس نے کام کی تلاش بند کر دی تھی۔ غزلیں سُنا سُنا کر اس نے دس بارہ دوست بنا لیے جن سے وہ ہر مہینے بیس بیس روپے بٹور لیتا تھا بس اِسی کو اُس نے روزگار سمجھ لیا۔ نوکری ملتی بھی تو دو سو روپے مہینے سے زیادہ کی کیا ملنی تھی۔
ایک دفعہ میں نے اُسے ملازمت ڈھونڈ بھی دی تھی لیکن ایک مہینے بعد اُس نے استعفا دے دیا۔ ترکِ ملازمت کی وجہ یہ بتائی کہ اتنے پیسے تو میں مانگ کر کما لیتا ہوں۔
آہستہ آہستہ یہ طرزِ زندگی مستقل صورت اختیار کر گئی۔ قریب دو سو روپے دوستوں سے وصول کر لیے۔ اِس کے علاوہ کوئی خوش ہو کر کھانا کھلا دیتا تھا اور کوئی سینما دکھا دیتا تھا۔ کسی نے پتلون سِلا دی تو کسی نے جوتا لے دیا۔ اس طرح شگفتہ ایک اچھی خاصی زندگی بسر کر رہا تھا ہاں قباحت اس طرزِ زندگی میں یہ تھی کہ اس کا دل شراب پینے کو چاہ رہا ہے لیکن دوست اسے سینما دیکھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس نے ایک پتلون کے لیے ہاتھ پھیلایا لیکن کسی دوست نے اُسے اچھا کھانا کھلا دیا۔ شگفتہ نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ فلاسفروں کی طرح کہتا تھا "زندگی میں سب خواہشیں کب پوری ہوتی ہیں؟ اُن کی بھی نہیں ہوتیں جن کی آمدنی کے وسائل اُن کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ میں تو پھر کسی کا ملازم بھی نہیں ہوں۔
ایسا آدمی فاقہ تو کر سکتا ہے۔ بھوک ہڑتال نہیں کر سکتا۔ وہ تو مقصد والی زندگی کا قائل ہی نہیں ہے، پھر یہ جنگ کس لیے؟
اچانک میرے مُنہ سے نکلا "بالکل جھوٹی خبر ہے" یہ سنتے ہی میری بیوی نے بغیر پوچھے کہ میں کس خبر کو جھوٹ کہہ رہا ہوں، ریمارک کسا:
"اخبار والے جھوٹی خبر کیوں چھاپیں گے۔ جھوٹ اور سچ کی چھپائی کا ریٹ تو

ایک ہی ہے"۔
اُس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اخبار والے اکثر جھوٹی خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔ ہم نے تو سُنا ہے کہ کئی بار جھوٹی خبر چھاپنے کے انھیں الگ سے پیسے ملتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے یہ خبر بھی جھوٹی ہو۔
پھر میں نے بیوی کو پوری خبر پڑھ کر سنائی۔ اُسے یاد دلایا کہ شگفتہ خود کئی بار ہمارے گھر آکر مفت کی روٹیاں توڑ چکا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ یہ وہی شگفتہ ہے جو میرا کوٹ مانگ کر لے گیا تھا ایک دن کے لیے۔ اور پھر لوٹایا نہیں کیونکہ بقول اُس کے سردی بڑھ گئی تھی۔ لیکن میری بیوی پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے تو خبر سنتے ہی شگفتہ کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا۔ مجھے لگتا ہے ہر عورت میں کسی نہ کسی گرو کا چیلا بننے کی ازلی خواہش ہوتی ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ عورتوں کا گرو کبھی بھوکا نہیں مرتا۔
بیوی کہنے لگی "کچھ لوگ ہیں جو صرف اپنے لیے جیتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ گھر میں اپنا لڑکا بیکار بیٹھا ہے اور اُس کو ملازمت دلوانے کے لیے دو قدم چل کر نہ گئے اور ایک شگفتہ ہے کہ پورے ہندستان کے نوجوانوں کو ملازمت دلانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہے۔
پھر جوش میں آکر اُس نے ایک نعرہ لگایا "محمد علی شگفتہ" اور خود میرے مُنہ سے نکل گیا۔ "زندہ باد" نکل جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کس فضول آدمی کے لیے زندہ باد کہہ رہا ہوں۔ ایسا احساس اکثر ہمیں زندہ باد کہنے کے بعد ہوتا ہے۔
میری بیوی نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا: مہاتما گاندھی کے بعد آج ایک اور بڑا آدمی پورے ملک کے لیے جان کی بازی لگا رہا ہے۔" کہاں مہاتما گاندھی اور کہاں محمد علی شگفتہ لیکن میرا خیال ہے میری بیوی نے یہ جملہ اِس لیے کہہ دیا کہ ہم لوگ محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ایاز خود بڑا خوش ہوتا ہے کہ وہ محمود کے ساتھ اسی صف میں کھڑا ہے۔ لیکن محمود پر کیا گزرتی ہے، اس کا کبھی ہم نے خیال نہیں کیا۔

میں نے سوچا چونکہ میرے گھر میں شگفتہ کے پیروکار پیدا ہو گئے ہیں اس لیے مجھے یہاں سے کھسکنا چاہیے۔ میں نکل کر اپنے دوست سکینہ کے گھر کی طرف چلا گیا سکینہ بھی میری طرح شگفتہ کا بیس روپے مہینے والا دوست تھا۔

سکینہ اپنے گھر کے باہر سڑک پر بیٹھے ہوئے ایک چائے والے سے چائے پی رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیوں سکینہ بیوی سے جھگڑا ہو گیا ہے جو باہر چائے پی رہے ہو" کہنے لگا "یہ بات نہیں ہے۔ بیوی گھر میں ہے ہی نہیں، شگفتہ جی کے درشنوں کو گئی ہوئی ہے"۔

اچھا تو خبر یہاں بھی پہنچ چکی تھی۔

سکینہ بھی میری طرح پریشان تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یا تو یہ ہڑتالی شگفتہ ہمارا یار نہیں اور یا پھر یہ خبر غلط ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ خود معاملے کی تفتیش کی جائے۔

چنانچہ سکینہ کے اسکوٹر پر سوار ہو کر ہم وزیر اعظم کی کوٹھی کی طرف چل دیے۔ واقعی یہ ہمارا ہی شگفتہ تھا۔

ایک چادر کو خیمے کی شکل دیکر وہ سمادھی لگائے بیٹھا تھا۔ ارد گرد گتے پر لکھے ہوئے کچھ نعرے تھے۔

"مر جاؤں گا پر اپنی مانگیں منوا کر چھوڑوں گا"۔

"سب کو ملازمت دو، ورنہ گدی چھوڑ دو"۔

"لے کے رہیں گے اپنا حق"۔ وغیرہ۔

بیس پچیس عورتیں لائن بنا کر اس کے درشنوں کے لیے کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر کہا: "دیویو اب جاؤ"۔ "اب ہم تھوڑا آرام کریں گے"۔

عورتیں چلی گئیں تو سکینہ اور میں نے اُس پر تہمتوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے؟"

"تو نے زندگی بھر کچھ کیا ہے جو دوسروں کے لیے ملازمت مانگ رہے ہو؟"

"وزیر اعظم کی جیب میں نوکریاں رکھی ہیں جو وہ ابھی تمھارے حوالے کر دیں گے؟"

"کس پارٹی سے پیسے لے کر یہاں بیٹھے ہو؟"
شگفتہ نے بڑی مشکل سے ہنسی روکا اور کہا "یار میری بھی تو سنو۔"
"کیا سنیں تیری" میں نے کہا۔ "آج تک تو نے کبھی اپنی محنت سے ایک پیسا بھی کمایا ہے۔ کھانا تجھے کوئی کھلاتا ہے۔ کپڑے تجھے کوئی خرید کر دیتا ہے۔ سینما تجھے کوئی اور دکھاتا ہے۔ شراب تجھے کوئی اور پلاتا ہے۔ پھر یہ بھوک ہڑتال کس لیے؟"
شگفتہ نے اس بار قدرے سختی سے ہمیں ٹوک دیا اور بولا۔
"میں مانتا ہوں کہ آپ لوگ ہی میرے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ اپنی مرضی سے۔ مجھے پتلون چاہیے لیکن آپ نے جوتا لے دیا کیونکہ آپ نے منت مانگ رکھی تھی کہ جب میری ترقی ہو گی میں کسی غریب آدمی کو جوتا لے دوں گا۔ میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں، آپ کھانا کھلانے پر بضد ہیں۔ اسی چکر میں مجھے کئی بار چار چار لنچ کھانے پڑے اور کئی بار وہی فلم پانچ بار دیکھنی پڑی۔"
"لیکن اس کا تمھاری بھوک ہڑتال سے کیا تعلق" سکینہ بولا۔
"تعلق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی وزیر اعظم سارے ہندستان کے لوگوں کو نوکری نہیں دلا سکتا۔ لیکن کوئی وزیر اعظم یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے جیسا کوئی من چلا بن آئی موت مر جائے۔ اس لیے ابھی وزیر اعظم کے گھر سے کوئی چھوٹا موٹا کرم چاری آئے گا۔ مجھے سمجھائے گا کہ ہم آپ کی مانگیں پوری کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اس لیے بھوک ہڑتال ختم کر دیجیے۔ میں مان جاؤں گا۔
"پھر؟" میں نے پوچھا۔
"پھر وہ ایک بڑے گلاس میں سنگترے کا جوس لیکر آئے گا کہ بھوک ہڑتال کو ختم کرانے کا یہی طریقہ رائج ہے۔"
"میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ تم نے بھوک ہڑتال کی کیوں؟"
"اس لیے کہ آج میں سنگترے کا جوس پینا چاہتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ کوئی دوست میرے کہنے پر مجھے جوس نہیں پلائے گا۔"
یہ سنتے ہی میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "اگر ہم تمھیں جوس پلا دیں تو؟"

شگفتہ اٹھا، چپل پہنی، چادر لپیٹی اور کہنے لگا۔
"چلو۔ جب مقصد ہی حل ہو گیا تو پھر یہاں بیٹھنے سے فائدہ؟"
میں شگفتہ کے ساتھ جوس کے اسٹال کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ "جو لوگ وزیرِ اعظم کے گھر کے باہر، بوٹ کلب پر یا رام لیلا گراونڈ میں اپنے مطالبے منوانے کے لیے بڑے بڑے جلوس نکالتے ہیں۔ اُن سے کبھی کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا کہ بھائی آپ کا اصل مطالبہ کیا ہے۔

گوشے میں قفس کے...

اردو رسائل کے مدیر جب کسی ادیب پر مہربان ہوتے ہیں تو اپنے کسی شمارے میں اس کا "گوشہ" شائع کرنے کی پیش کش کرتے ہیں۔ "گوشہ" کا مطلب یہ ہے کہ ایک شمارے کے کچھ صفحے خاص طور پر اُس ادیب کے لیے محفوظ کر دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر اس گوشے میں ادیب اگر افسانہ نگار ہے تو اس کا ایک آدھ افسانہ، اور اگر شاعر ہے تو اس کی چند ایک غزلیں اور نظمیں، اور اُس پر لکھے ہوئے دو ایک تعریفی مضامین ہوتے ہیں۔ یہ سارا سامان یک جا شائع کیا جاتا ہے۔

پتہ نہیں کیوں جب بھی میں کسی رسالے میں کسی ادیب کا گوشہ دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک ایسے بزرگ کی تصویر ابھر آتی ہے جس نے اپنی زندگی میں خوب پیسا کمایا کوٹھی کھڑی کی، لیکن جب وہ مزید کام کاج کے لائق نہ رہا تو اُس کی اولاد نے اسے اسی کوٹھی کے ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا۔ اس کا بستر اور صندوق، اس کے پانی پینے کے لیے گلاس اور صراحی اُسی کمرے میں رکھوا دی گئی۔ بزرگ کو کہہ دیا گیا کہ اب اِس کمرے سے باہر نہیں آنا۔ اگر گھر میں آیا ہوا کوئی مہمان اسے ملنا چاہتا تو اسے بھی وہیں بھیج دیا جاتا۔ اگر کوئی مہمان اُس بزرگ سے ملاقات کا خواہش مند نہ ہوتا تو اُسے اُس طرف جانے کے لیے مجبور نہ کیا جاتا۔

کسی ادیب کو ایک مخصوص گوشے میں شائع کرنے کا مقصد بھی شاید یہی ہے کہ اگر کوئی قاری اسے پڑھنا چاہے تو رسالے کے صفحہ ۱۰۷ سے ۱۴۱ تک کا مطالعہ کرے اور اگر نہ پڑھنا چاہے تو ان صفحات سے بخوشی درگذر کر جائے۔ گویا ادیب مذکور کو ان صفحات

میں بند کر دیا گیا اور اسے منع کر دیا گیا کہ رسالے کے باقی صفحوں میں تمھارا داخلہ ممنوع ہے۔ قارئین اگر چاہیں تو رسالے کا مطالعہ اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ وہ ادیب اُن کے مطالعے میں مخل نہیں ہوگا۔

گوشہ نکالنے کا بظاہر مطلب تو یہ بتایا جاتا ہے کہ ادیب مذکور کی عزت افزائی کی جا رہی ہے۔ لیکن اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بظاہر مطلب کبھی صحیح مطلب نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا گوشہ کبھی نکلا ہے تو بھلے ہی آپ اس بات کا اقرار نہ کریں لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ مدیر مذکور نے اپنی کوٹھی میں آپ کے لیے گوشہ تعمیر کرانے کے لیے آپ ہی سے اینٹیں اٹھوائی تھیں اور آپ ہی سے گارا بنوایا تھا جس سے گوشے کی لپائی ہوئی تھی اور وہ لپائی خود آپ نے اپنے دست مبارک سے کی تھی۔

گوشہ نکالنے کا رائج طریقہ کچھ اس طرح کا ہے۔

گوشہ نکالنے کا فیصلہ سنانے کے بعد مدیر ادیب کو کہتا ہے کہ اپنی تحریروں کا انتخاب کرو۔ انتخاب اگر مدیر کو پسند آجائے تو بہتر، ورنہ مزید انتخاب کرو۔ تیسری بار وہ ادیب کو مزید انتخاب کرنے کو اس لیے نہیں کہتا کہ عام طور پر اب انتخاب کرنے کو کچھ رہ نہیں جاتا۔ جب یہ طے ہو جائے کہ ادیب کی کون سی تحریریں گوشے میں جائیں گی تو پھر ادیب کو اس کام پر لگا دیا جاتا ہے کہ اب کوئی دو ایسے ناقد ڈھونڈو جو تمھاری تعریف میں قصیدے لکھ سکیں۔ ناقد تلاش کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ اُن سے قصیدے لکھوانا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہاں البتہ مہنگا ضرور ہے کیونکہ قصیدے لکھے جاتے کے دنوں میں ناقد حضرات کی دال روٹی ادیب کے ذمّے ہوتی ہے اور پتہ نہیں کیوں قصیدہ لکھتے وقت ناقد کی بھوک بہت تیز ہو جاتی ہے۔

آج کل ادیب کے گوشے میں ایک مضمون اُس کی بیوی کی طرف سے بھی ہوتا ہے، جس میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کرے میرے شوہر جیسا نیک، رحم دل اور ذمہ دار انسان سب عورتوں کو نصیب ہو۔ یہ ابھی تک طے نہیں ہو پایا کہ اِس دعا کے ذریعے ادیب کی بیوی کیا اپنی ہم جنسوں کی خوشی مانگ رہی ہے یا اُن سے کسی انجانی بدسلوکی کا بدلہ لے رہی ہے۔

گوشہ چھپ کر تیار ہو گیا۔ ادیب کی قدرتی طور پر خواہش ہوتی ہے کہ یہ رسالہ

گھر گھر جائے، کیونکہ جنگل میں ناچتے مور کو آج تک کوئی دیکھنے نہیں گیا۔ اردو ادب کی روایت کے مطابق مور کو گھر گھر جا کر ناچنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ گوشے والے ادیب کا فرض ہے کہ وہ رسالہ ہذا کی کاپیاں خرید کر بانٹے۔ کسی رسالے میں جب آپ یہ اعلان پڑھیں کہ ہمارا پچھلا شمارہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں کسی کا گوشہ تھا اور اس شمارے کی بکری میں اُس ادیب کے گاڑھے پسینے کی کمائی شامل ہے۔

رسالہ خرید کر دوستوں تک پہنچانا کوئی بُرا کام نہیں بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ کارِ ثواب ہے کہ اس طرح ہم سب کی پیاری اردو زبان ترقی کرتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رسالہ ہاتھ میں دیے جانے کے بعد بھی آپ کے گوشے تک کسی کی نظر جائے گی یا نہیں؟ رسالہ یا کتاب کو قارئین تک پہنچانا اتنا مشکل کام نہیں جتنا اسے پڑھوانا۔ اس وقت کا احساس مجھے حال ہی میں ہوا جب میرے بیٹے کو اسکول کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کم از کم ایک اَن پڑھ کو تعلیم دے۔ گھر کے سب افراد نے کوشش کی کہ اس بچے کو کسی طرح ایک شاگرد مہیا کروا دیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ گھر کے نوکر کو ہی وہ ایک گھنٹہ روز پڑھایا کرے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم کا سارا سامان خرید کر نوکر کو دے دیا گیا اور میرا بیٹا شام کو باقاعدگی سے اسے ایک گھنٹہ روز پڑھانے لگا۔ تعلیم کا اس نوکر پر کیا اثر ہوا اس کا احساس مجھے مہینے کے خاتمے پر ہوا جب اُس نے تنخواہ کے علاوہ تیس روپے اور مانگے۔ جب پوچھا گیا کہ یہ تیس روپے کس لیے تو کہنے لگا کہ پڑھتا بھی تو رہا ہوں۔

مجھے غلط مت سمجھیے، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اردو کے قارئین رسالہ پڑھنے کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں پڑھنے کو ایک مشقت سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں کون پڑھے گا آپ کا گوشہ؟

چند دن پہلے ایک رسالے کے مدیر مجھ سے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ صاحب آپ کی اردو ادب کی خدمات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے شمارے میں آپ کا گوشہ شائع کیا جائے۔ میں چونکہ گوشے سے پیدا ہونے والی ضمنی پیچیدگیوں سے واقف ہوں اس لیے عرض کی کہ حضور مجھے بخش دیجیے۔ پوچھا "کیوں" میں نے دل ہی دل میں جو کہا وہ تو کچھ اور تھا لیکن زبان سے یہ جواب دیا کہ میں اپنے

آپ کو ابھی تک گوشے کا اہل نہیں سمجھتا۔ کہنے لگے" آپ کی مرضی لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ بغیر گوشے کے آپ کا نام گمنامی کے گوشے میں رہ جائے گا۔ آپ کی حالت اُس قیدی کی سی ہوگی جو قفس میں بند ہے اور جسے کوئی نہیں جانتا"۔ میں نے کہا" وہ تو آپ نے بجا فرمایا لیکن بقول شاعر ؎

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے "

دیکھنے ہم بھی گئے...

دو سال پہلے کی بات ہے مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔
یہ حادثہ کیسے ہوا یہ بھی سننے کی بات ہے۔ ایک دن میں گھر سے انڈیا گیٹ کے لانز پر لگا ہوا ایک میلہ دیکھنے نکلا۔ دو روپے کا ٹکٹ لے کر جب میں میلے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ میلے میں داخلے کا ٹکٹ دراصل لاٹری کا ایک ٹکٹ ہے۔ اس لاٹری میں کسی ایک خوش قسمت کو امریکہ آنے جانے کا ایک ٹکٹ مفت دیا جائے گا۔ یہ اعلان سُننے کے بعد میری دلچسپی میلے میں گھٹ گئی اور امریکہ میں بڑھ گئی۔ لوگ جب کباب خرید کر کھا رہے تھے اور جھولوں پر جھول رہے تھے میں ایک کونے میں بیٹھا دعا مانگ رہا تھا کہ میری لاٹری کھل جائے۔ شام کو جب لاٹری کھُلی تو میرے ہاتھ میں امریکہ کا ایک ٹکٹ تھما دیا گیا۔
جب ٹکٹ مل گیا تو امریکہ تو جانا ہی تھا۔ ہمارے ہاں تو لوگ بغیر ٹکٹ سارا ہندستان گھوم آتے ہیں میرے پاس تو باقاعدہ ٹکٹ تھا ——— بہت کوشش کے بعد پتا چلا کہ ہمارا ایک بہت ہی دور کا رشتہ دار نیویارک میں رہتا ہے۔ اردو میں محبت بھرے خط لکھ کر اس دور کے رشتے کو قریبی رشتے میں تبدیل کیا گیا اور ہم نیویارک جا پہنچے۔
اِس قریبی رشتہ دار نے ہمیں نیویارک کی خوب سیر کرائی۔ جب ہمارے قیام کی مدّت ختم ہونے کو آئی تو اُس نے یاد دلایا کہ ہم نے وہ نفیس منزلہ اسٹور تو دیکھا ہی نہیں جس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُس نے کہا: یہ اسٹور دنیا کا سب سے بڑا اسٹور ہے۔ یہ تمھیں ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس اسٹور کی خوبی یہ ہے کہ

اس میں سوئی سے لیکر ہاتھی تک بیک وقت خرید ا جا سکتا ہے"۔
میں نے اُسے بہتیرا سمجھایا کہ مجھے نہ تو سوئی کی ضرورت ہے نہ ہاتھی کی لیکن وہ نہیں مانا۔ کہنے لگا اسٹور کے اندر گھوم لینا ہی زندگی کا ایک تجربہ ہے جو مجھے ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ چناں چہ ایک دن وہ مجھے اسٹور کے اندر دھکیل کر خود چلا گیا۔
اندر جا کر میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ پہلے ہی سیکشن میں گیا تو دیکھا کہ صرف سینٹ کی شیشیاں رکھی ہیں، اتنی شیشیاں کہ اگر انھیں لنڈھا دیا جائے تو خوشبو کی لہریں پورے ہندستان کی فضا کو معطر کر دیں حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے پریشانی صرف یہ تھی کہ میری جیب میں کل چار ڈالر تھے اور چار ڈالروں میں خوشبو کی شیشیوں کو لنڈھانا تو در کنار ہاتھ لگانا بھی ممنوع تھا۔
اسٹور میں میری حالت ایک ایسے خریدار کی تھی جو صرف خواہشات کے زور پر دنیا کی نعمتیں خریدنا چاہتا ہے پھر خیال آیا کہ اپنے ملک میں گھی اور چاولوں کے بغیر پلاؤ پکایا جا سکتا ہے جسے لوگ خیالی پلاؤ کہتے ہیں، وہی نسخہ امریکہ میں کیوں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔
چناں چہ جیب میں اپنی غریبی کو مضبوطی سے تھامے، اور اپنے دل و دماغ پر امیری سوار کیے، میں خوشبوؤں کی شیشیوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اچانک اسٹور کے اُس سیکشن کا انچارج میرے سامنے آکھڑا ہوا اور یہ کہنے لگا: "کہیے حضور میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"۔ اب آپ ہی بتائیے جس شخص کے جیب میں کل چار ڈالر ہوں اور دنیا بھر کے سامان پر اس کی نظر ہو اُس کی کوئی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ چناں چہ میں نے جواب دیا "میں بس دیکھ رہا ہوں" اُس نے تعظیم سے جھک کر کہا۔ "خوشی سے دیکھیے"۔
یہی سلوک میرے ساتھ کپڑوں والے سیکشن میں ہوا بالکل یہی سلوک میرے ساتھ برتنوں والے سیکشن میں ہوا اور بالکل ایسا ہی سلوک میرے ساتھ جوتوں والے سیکشن میں ہوا۔ مجھے لگا کہ انچارج لوگ میری راہ میں روڑہ اٹکا رہے ہیں۔ میں اُس بڑے اسٹور کو صرف دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ لوگ مجھے اپنا سب کچھ بیچنا چاہتے ہیں اُس وقت میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا وہ تھا باہر جانے کا راستہ۔ چپ چاپ اسٹور

سے باہر نکل جاؤں اور پھر ہندستان جاکر اپنے تخیل کا سہارا لیکر قصّے سناتا رہوں
کہ میں نے اُس بڑے اسٹور کی تیس منزلوں میں کیا کیا دیکھا۔
جب ہمارے دوست لندن میں چار دن گذار کر تین تین سو صفحوں کا سفرنامہ
لکھ سکتے ہیں جس میں چالیس عورتوں سے اُن کے عشق کا ذکر ہوتا ہے جو ریاضی کے
مطابق دس عورتیں ایک یوم کے حساب سے پڑتی ہیں تو میں آدھ گھنٹہ ایک اسٹور میں
رہ کر اُس کی تیس منزلوں کا حال کیوں نہیں سُنا سکتا۔
میں دروازے کی طرف مُڑا ہی تھا کہ کسی شخص نے میرا راستہ روک لیا
اور میرے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا: "کیا حضور کو ہمارے اسٹور میں
کچھ بھی پسند نہیں آیا؟" اس کا لہجہ کچھ اتنا ہمدردانہ تھا کہ میں نے اُسے اپنی پوری کتھا
سنادی۔ میں نے کہا: "میں ایک سیّاح ہوں اور عام سیّاحوں کی طرح کچھ خریدنے
کا اہل نہیں ہوں۔ فی الحال میں صرف آپ کا اسٹور دیکھنے آیا ہوں۔ لیکن یہاں کے
ملازم مجھے اسٹور دیکھنے نہیں دے رہے۔ اگر آپ اِس اسٹور کو بلا روک ٹوک
دیکھنے میں میری مدد کریں گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے یار دوستوں اور رشتہ
داروں کو سودا خریدنے کے لیے یہیں بھیجا کروں گا۔
وہ ہنسا اور کہنے لگا "آپ بے شک گاہک بھیجنے کی تکلیف نہ کریں کیوں
کہ روزی تو ہمیں اللہ کے فضل سے مل ہی رہی ہے لیکن اِسٹور دیکھنے کا بندوبست
میں کرتا ہوں۔ آئیے میرے ساتھ۔"
بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اُس اسٹور کا مالک ہے۔ وہ مجھے اپنے دفتر میں
لے گیا اور بصد خلوص اس نے میرے کوٹ کے کالر پر ایک تمغا لگا دیا ایسے
جیسے مجھے پدم شری دے رہا ہو۔ تمغا لگا کر کہنے لگا "اب آپ کہیں بھی جائیے،
اسٹور میں آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔"
میں نے جلدی سے آکر ایک آئینے میں دیکھا۔ تمغے پر لکھا تھا "صرف دیکھ
رہا ہے" اس کے بعد میں کہیں بھی گیا۔ اسٹور کے ملازم میرے پاس آتے تھے
اور تمغے کی عبارت پڑھ کر مسکراتے ہوئے چلے جاتے تھے۔
ہندستان لوٹنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے چاہیئے تھا کہ کہیں سے

اُدھار مانگ کر ایسے کئی تمغے خرید لاتا کیوں کہ ایسے تمغوں کی یہاں بہت ضرورت ہے۔

دہلی میں میرے گھر کے سامنے کوئی سڑک کھود گیا ہے۔ یہ کوئی ایک سال کی بات ہے۔ برسات ہوئی تو اس کھدے ہوئے حصے میں پانی بھر گیا یہ پانی مٹی کے ساتھ مل کر کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ میرا گھر سے نکلنا جب دو بھر ہو گیا تو میں نے متعلقہ محکموں میں کئی درخواستیں دیں کہ اس سڑک میں سے جو خزانہ آپ نکالنا چاہتے تھے وہ اگر نکال چکے ہوں تو اب سڑک کے گڑھے کو بند کر دیجیے ہر بار جواب یہ آتا تھا کہ ہم آپ کی شکایت کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر میں امریکہ سے بہت سارے تمغے لایا ہوتا تو ان میں سے کم از کم ایک تمغا تو اس محکمے کے افسر کی چھاتی پر آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔

ایک اڈیٹر کو میں نے بغرض اشاعت ایک مضمون بھیجا۔ اِس واقعے کو نو مہینے گزر گئے ہیں وہ نہ تو اسے شائع کرتا ہے اور نہ ہی اسے لوٹاتا ہے۔ ہر بار جب یاد دہانی کراتا ہوں تو جواب دیتا ہے کہ آپ کے مضمون کو ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس اڈیٹر کا کیا اِس تمغے پر حق نہیں ہے۔

کوئی چھ مہینے پہلے میرے ہاں ایک صاحب تشریف لائے تھے کہا یہ تھا کہ وہ اپنی دختر نیک اختر کی شادی کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ پہلی بار آئے تو میری عمر پوچھ کر اور قد ناپ کر چلے گئے پھر آئے تو ملازمت اور تنخواہ کے بارے میں سوال کرتے رہے تیسری بار آئے تو میرے خاندان کا شجرۂ نسب بنا کر ساتھ لے گئے پھر آئے تو مجھے چلا پھرا کر اور ہلا ڈلا کر دیکھتے رہے۔ اِس طرح میری امید بندھتی رہی لیکن جب دیکھا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر رہے تو میں نے اپنے عزیزوں کی معرفت یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کر کیا رہے ہیں؟ بیٹی کی شادی کا ارادہ ہے یا وقت گزاری کر رہے ہیں؟ میرے عزیزوں نے جب اُن سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا "میں لڑکے کو دیکھ رہا ہوں"۔ پتا نہیں میری شادی یہاں ہو گی یا نہیں اور اگر شادی ہو گئی تو لڑکی میرے حق میں نعمت ثابت ہو گی یا مصیبت لیکن اس وقت میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ امریکہ کے ایک تمغے پر اس بزرگ کا حق بھی ضرور ہے۔

اس تمغے پر اُن افسروں اور کلرکوں کا بھی حق ہے جو فائلیں دیکھ رہے ہیں اور بس دیکھ رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فرم یہاں ایسے تمغے بنانا شروع کرے تو تکری

لاکھوں میں ہو سکتی ہے لیکن میں جب بھی کسی کارخانے دار سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں تو وہ یہی جواب دیتا ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ایک اعلا عہدیدار نے اس تمغے پر لکھی عبارت کا خوب فائدہ اٹھایا پتا نہیں اسے اس تمغے کا پتا امریکہ کے اس اسٹور سے معلوم ہوا یا یہ اُس کے کسی مشیر کا مشورہ تھا کہ یہ تمغا بڑا کارآمد ہے، اسے استعمال میں لائیے۔ اعلا عہدیدار کو یہ مشورہ اتنا پسند آیا کہ اس نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ تمغے کی عبارت تو وہی تھی لیکن انھوں نے اس میں دو بڑی تبدیلیاں کیں۔ پہلی یہ کہ اُس نے یہ عبارت اپنے کوٹ کے کالر پر لکھنے کے بجائے اپنی زبان پر لکھ لی۔ اور دوسرے یہ کہ اُس نے اس عبارت کی کئی شکلیں بنالیں۔ اُس کی زبان پر کبھی تو یہ عبارت ہوتی تھی کہ "ہم دیکھ رہے ہیں"۔ کبھی یہ کہ "ہمیں دیکھنا ہے" اور کبھی یہ کہ "ہم دیکھیں گے"۔

میں اُس کی قابلیت کی داد دیتا ہوں کہ اس نے اس تمغے کی عبارت کو اپنی یا اپنے مشیروں کی تخلیقی قوت سے وسعت بخشی لیکن اس کا ایک نقصان بھی ہوا یہ نعرہ (تمغے کی عبارت کو نعرہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جو شے زبان تک پہنچ گئی وہ سمجھ لیجیے نعرہ بن گئی) رعایا کو بہت پسند آگیا۔

اعلا عہدیدار نے جب بار بار رعایا سے کہا کہ "ہم دیکھیں گے" تو رعایا بھی کہنے لگی کہ ہم بھی تجھے دیکھیں گے۔ نتیجہ اِس کا اعلا عہدیدار کے لیے بہت خطرناک نکلا وہ بیچارہ تو صرف کہتا ہی رہا کہ ہم دیکھیں گے لیکن رعایا نے تو سچ کر دکھایا کہ "ہم تجھے دیکھ لیں گے"۔

جوابی خط

یہ ایک خط کا جواب ہے جو مجھے بلیماران دلی کے کسی نسیم صاحب نے لکھا ہے۔
اپنے خط میں نسیم صاحب مجھ پر بہت برسے ہیں، خوب گالیاں دی ہیں، ایسی گالیاں جنھیں کھا کر میں بہت بدمزہ ہوا۔ مجھے انھوں نے اور باتوں کے علاوہ گرہ کٹ کا بھائی چور کہا ہے۔ صرف گالیوں پر اکتفا کیا ہوتا تو شاید میں برداشت کر جاتا، لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کبھی ان کے ہتھے چڑھ گیا تو میری ہڈی پسلی برابر کر دیں گے۔
نسیم صاحب نے اپنے خط میں بڑے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے ہیں کچھ اُس وزن کے الفاظ جو عبادت بریلوی صاحب اپنے تنقیدی مضامین میں کیا کرتے ہیں اُن کے وزن دار الفاظ سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ پہلوان قسم کے آدمی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے آدمی کے دل میں میرے لیے پرخاش رہے۔ اس لیے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔
میرا خط پڑھنے سے پہلے نسیم صاحب کی ناراضگی کا پس منظر دیکھ لیجیے۔ کچھ مہینے پہلے مرزا عبدالودود کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "گٹھلیوں کے دام" شائع ہوا تھا۔ مرزا اپنی کتاب میرے پاس لائے تھے کہ میں اُس پر تبصرہ کر دوں۔ وہ تبصرہ دلی کے رسالہ "گھامڑ" میں شائع ہو گیا۔ نسیم صاحب نے وہ تبصرہ پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "گٹھلیوں کے دام" مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے چنانچہ بیس روپے میں انھوں نے یہ کتاب خرید لی جب کتاب پڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ ٹھگ لیے گئے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ کتاب پڑھ کر انھیں یوں لگا جیسے کسی نے اُن کی جیب کاٹ لی ہو، جس میں بیس روپے تھے اور چونکہ انھوں نے یہ کتاب میرے تبصرے کی بنا پر

خریدی تھی اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ میں اس جیب کترے کا رشتہ دار ہوں۔
نسیم صاحب آپ کے خط کو پڑھنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو کتاب پڑھنے کی تمیز تو شاید ہے تبصرہ پڑھنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں نے یہ ہرگز نہیں لکھا کہ یہ کتاب مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے یہ بھی نہیں لکھا کہ مرزا عبدالودود کی کتاب بالکل واہیات چیز ہے لیکن اگر میں اس طرح لکھتا تو مرزا اُسی طرح میرے خون کے پیاسے ہوتے جیسے آج آپ ہیں۔ اور ماشاء اللہ ان کی صحت آپ کی صحت سے کسی لحاظ سے کم نہیں۔

آئیے میں آپ کو تبصرہ پڑھنا سکھاؤں۔ میں نے لکھا تھا کہ "مرزا عبدالودود نے بہت ہی قلیل مدت میں مزاح نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی ہے۔" آپ نے سمجھا میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مرزا جب مزاح کے میدان میں داخل ہوئے تو وہاں پہلے سے موجود مزاح نگاروں نے اپنی اپنی نشست چھوڑ کر اُن کی خدمت میں گزارش کی کہ حضور یہ کرسیاں دراصل آپ ہی کے لائق ہیں۔ تشریف رکھیے۔ نسیم صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں نے تو تبصرے کی زبان میں یہ کہنے کی کوشش کی تھی کہ مرزا نے مزاح نگاروں کی صف میں بالکل ایسے جگہ بنائی ہے جیسے ریل کے ایک بہت ہی بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک نیا مسافر اپنی جگہ بناتا ہے یعنی دروازہ بند پا کر پہلے انھوں نے کھڑکی سے بستر اور صندوق پھینکا۔ پھر اُسی رستے خود کود پڑے۔ بستر کسی کے سر پر پڑا۔ صندوق نے کسی اور کو زخمی کیا اور دو مسافر ان کے اپنے بوجھ کے نیچے دب گئے۔ ایسا بھونچال آنے پر لوگ خود ہی اِدھر اُدھر سرک گئے اور اس طرح مرزا نے اپنی جگہ بنالی۔

میں نے لکھا تھا کہ "مرزا نے ابھی ابھی اس دشت میں قدم رکھا ہے۔ اِس دشت کی سیاحی کے لیے تو عمر پڑی ہے۔" آپ سمجھے میں کہہ رہا ہوں کہ اُن کا قدم پڑتے ہی اِس دشت میں پھول اُگ آئے ہیں۔ جب وہ پوری عمر اسی دشت میں قدم رکھے رہیں گے تو یہ دشت نشاط باغ بن جائے گا۔ حضور میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو مرزا کو بڑے پیار سے یہ مشورہ دے رہا تھا کہ بھیا اس دشت کی سیاحی کے لیے تو عمر پڑی ہے ابھی سے اس میں کیوں کود رہے ہو۔ بیس پچیس سال اور صبر کرو۔ جب کوئی اردو پڑھنے والا نہیں رہے گا تو آپ شوق سے اس دشت کی سیاحی پر اُترنا تاکہ کوئی آپ کی اُنس

بے راہ روی پر اعتراض ہی نہ کر سکے۔
میں نے لکھا ہے کہ "مرزا کا لکھنے کا انداز ریسی RACY ہے" آپ نے سمجھ لیا کہ ان کے انداز بیان میں وہی روانی ہے جو ریس کے گھوڑوں میں ہوتی ہے یعنی ایک خوبصورتی ایک ادا لئے بے نیازی کے ساتھ تیزی سے منزل تک پہنچنے کی آرزو۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ ریسی RACY سے میرا مطلب گھڑ دوڑ ہی سے ضرور تھا لیکن اُن گھوڑوں کی دوڑ سے نہیں جو بمبئی کے مہالکشمی میدان میں دوڑتے ہیں بلکہ اُن گھوڑوں سے تھا جو تانگوں کے آگے جتتے ہیں اور جو سڑکوں پر پیدل اور سائیکل سوار لوگوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور اگر اڑ جائیں تو ایسے اڑتے ہیں کہ کوچوان کا چابک بھی انھیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔
میں نے لکھا تھا کہ "کتاب کے تمام جملے مصنف کی محنت کے آئینہ دار ہیں"۔ آپ سمجھے میرا مطلب یہ ہے کہ مصنف نے ایک ایک جملے پر وہ محنت کی ہے جو ایک ذہین لڑکا اپنے امتحان کی تیاری میں کرتا ہے تاکہ وہ کلاس میں اوّل آسکے۔ نہیں صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا اشارہ اُس محنت کی طرف تھا جو ایک دھوبی ایک گندے قمیص میں سے میل نکالنے کی کوشش میں کرتا ہے یعنی پتھر پر مار مار کر۔ اتنے زور سے مارنے پر قمیص پھٹ جاتا ہے پر میل نہیں نکلتا۔
میں نے لکھا تھا کہ "مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی"۔ آپ نے سمجھا کہ یہ کتاب یوں بکے گی جیسے متھرا کے پیڑے یا ناگپور کے سنگترے یا بمبئی کی بھیل پوری۔ نسیم صاحب میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ آپ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اردو کی کوئی کتاب اِن معنوں میں ہاتھوں ہاتھ نہیں لی جاتی۔ یہ ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ دی جاتی ہے۔ یعنی کتاب کو آپ خود شائع کرتے ہیں اور پھر اُسے آپ دوسرے ادیبوں کو ہاتھوں ہاتھ بانٹتے ہیں وہ بھی کچھ اس طرح کہ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ یعنی وہ بھی آپ کو اپنی کتابیں اسی طرح پیش کریں۔
جہاں تک مرزا کی کتاب "گٹھلیوں کے دام" کا تعلق ہے میرا مطلب یہ بھی نہیں تھا۔ جب میں نے لکھا کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تو میرا مطلب تھا کہ پبلیشر سے یہ کتاب سیدھے ردّی والے لے جائیں گے۔ وہاں سے یہ لفافے بنانے

والوں کے ہاتھ جائے گی۔ وہاں سے یہ حلوائیوں کے ہاں جائے گی اور وہاں سے یہ گاہکوں کے پاس پہنچے گی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں پائے۔ خیر بیس روپے خرچ کرنے کے بعد تو سمجھ گئے ہوں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے تبصرے میں مرزا کے مضامین میں سے کچھ ایسے فقرے نقل کیے ہیں جو بہت خوبصورت اور معنی خیز ہیں۔ ان سے آپ کو دھوکا ہوا کہ شاید ساری کتاب ہی خوبصورت ہوگی۔

ایسے کتنے فقرے میں نے نقل کیے تھے؟ کل چار۔ اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ انھیں کتاب میں سے ڈھونڈنے میں مجھے کتنی ریاضت کرنی پڑی۔ تقریباً پوری رات میں کتاب کو کھنگالتا رہا تب کہیں جا کر یہ فقرے ہاتھ لگے .... ویسے ایک گزارش کر دوں کہ دو سو صفحے کی کتاب میں دو چار جملے تو اچھے نکل ہی آتے ہیں۔ بھائی جان وہ گھڑی جو کئی سال سے بند پڑی ہو وہ بھی دن میں دو بار صحیح وقت بتا سکتی ہے۔

آپ کی شکایت ہے کہ میں نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ "میں تمام اردو داں حضرات کو اس کتاب کے مطالعے کی پرزور سفارش کروں گا"۔ جی میں نے ضرور لکھا ہے۔ لیکن آپ کو یہ تو دیکھنا چاہیے تھا کہ سفارش کرنے والے کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ میں تو دن میں سیکڑوں لوگوں کو سفارشی خط دیتا رہتا ہوں۔ کبھی وزیر نشر و اشاعت کے نام، کبھی وزیر تعلیم کے نام، کبھی شہر کے میئر کے نام کہ اس کو ریڈیو کا اسٹیشن ڈائرکٹر بنا دو۔ اس کو کالج کا پرنسپل بنا دو۔ اس محلے میں پانی کا نل لگوا دو لیکن آج تک میرے سفارشی خط والے لوگوں کو کسی نے سرکاری دفتر کے قریب نہیں گھسنے دیا۔ میری سفارش پر لگے ہوئے نل سے کسی نے پانی نہیں پیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے میری سفارش کیوں مان لی۔

تبصرہ کو جلدی ختم کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ "میں مصنف اور قاری کے درمیان کھڑا نہیں رہنا چاہتا"۔ نسیم صاحب آپ اس کا مطلب یہ سمجھے کہ کتاب اتنی دل چسپ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ قاری جلد سے جلد اس کا مطالعہ شروع کر دے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ نہیں جناب میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو قاری بھی اس کتاب کو پڑھے گا مصنف کی گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہے گا۔ قاری کے کتاب پر پہنچتے

بھی مار پیٹ ہو گی۔ اِس لیے میں جلد از جلد راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا
کہ اس مار پیٹ میں میری پگڑی اترے۔

اب صرف اتنی سی بات رہ گئی کہ تبصرے اِس طرح کیوں لکھے جاتے ہیں کہ آپ
جیسا سیدھا سادہ قاری اُن کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ تبصرے کا
یہی اصول ہے۔ اور یہ اصول میں نے نہیں بنایا۔ ایک عرض اور کر دوں کہ جب مرزا صاحب
اپنی کتاب میرے پاس تبصرے کے لیے لائے تھے تو ساتھ ہی برفی کا ایک ڈبا بھی لائے
تھے۔ برفی بڑی اعلا قسم کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی خوشبو نے کتاب کے بارے میں
میری رائے میں مداخلت کی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ اچھے جہیز کے ساتھ ایک
معمولی لڑکی ایک اچھی دلھن بن جاتی ہے اور ساس سسر کے علاوہ دولھا میاں کو بھی
خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ تبصرہ نگاری میں اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے تو محض برفی کی
وجہ سے۔

امید ہے کہ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ تبصرہ کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ یقین
مانیے بیس روپے میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے۔ پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے
ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔"

آپ کا خیر اندیش
تبصرہ نگار

مشاورت کمیٹی

قارئین کرام! آپ نے اخباروں میں کئی ایسی دواؤں کے اشتہارات پڑھے ہوں گے جن کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ بڑے حکیم صاحب کی ذاتی نگرانی میں تیار کی جاتی ہیں لکھا ہوتا ہے کہ اس دوا کے استعمال سے آپ اپنے پرانے روگ سے شرطیہ چھٹکارا پا سکتے ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے فائدہ نہ ہو تو آپ ذاتی طور پر آکر بڑے حکیم صاحب سے مشورہ کر سکتے ہیں وہ اس مشورے کی کوئی فیس نہیں لیں گے ایسے اشتہار کا عنوان ہوتا ہے "مشورہ مفت"۔

جو حضرات ہمارے مضمون کو اس لیے پڑھ رہے ہیں کہ شاید آگے جا کر ہم بھی کسی ایسی دوا کا ذکر کریں گے جو اُن کو کسی خاص بیماری سے نجات دلائے گی تو ان کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ بے شک آگے نہ پڑھیں۔ ہمارا روئے سخن دوا کی طرف نہیں بلکہ مشورے کی طرف ہے۔

مشورہ دینے کا رواج ہمارے ملک میں نہ صرف مفت ہے بلکہ بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔

کچھ دن پہلے ہم جالندھر دوردرشن پر ایک پروگرام کرنے کی غرض سے وہاں گئے تھے۔ گاڑی جب جالندھر پہنچی تو صبح کا وقت تھا اور موسم خوشگوار تھا ہم نے سن رکھا تھا کہ ٹی وی سٹیشن ریلوے سٹیشن کے قریب ہی کہیں واقع ہے ہم نے سوچا کیوں نہ پیدل جایا جائے سیر بھی ہو جائے گی اور پیسے بھی بچ جائیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایک شخص سے ٹی۔ وی سٹیشن جانے کا راستہ پوچھا کہنے لگا "کیا آپ پیدل جانے کا ارادہ رکھتے ہیں"

"ارادہ تو یہی ہے" میں نے جواب دیا۔

کہنے لگا میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ رکشہ لے لیں، آرام سے پہنچ جائیں گے۔
آپ پیدل جائیں گے تو راستے کی گرد آپ کے جوتوں اور پتلون کو گندہ کر دے گی۔
تھوڑا سا چلنے کے بعد دھوپ بھی پریشان کرے گی۔ اس لیے میں اپنا مشورہ دہراؤں گا
کہ آپ پیدل نہ جائیں۔ ہم نے سمجھانے کی بہتیری کوشش کی حضور ہم نے آپ سے راستہ
پوچھا ہے، مشورہ نہیں مانگا۔ لیکن وہ ہماری بات کہاں سنتے، وہ تو مشورہ دینے میں
مصروف تھے۔

ویسے تو زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق آپ کو بے شمار لوگ مشورہ دینے کو
تیار نظر نہ آئیں لیکن بیماری کے متعلق مشورہ دینے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے لوگ
کہتے ہیں ہندستان میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ ایسا کہنے والوں سے میرا مشورہ ہے کہ کسی بس
سٹاپ پر ذرا سا کھانس دیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے کوئی آپ کو گرم پانی میں نمک ڈال کر
غرارے کرنے کو کہے گا۔ کوئی آپ کو جوشاندے کی چائے پینے کو کہے گا۔ کوئی آپ کو منہ میں
ملہٹی رکھنے کا مشورہ دے گا اور کوئی تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرے گا پھر
بھی اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈاکٹروں کی کمی ہے تو یہ اُن کی کم اندیشی کے سوائے اور کیا
ہے؟ ایک ایک مریض کو مشورہ دینے کے لیے چار چار ڈاکٹر تو ہم نے خود دیکھے ہیں۔ ہمارا تجربہ
تو یہ کہتا ہے کہ دوسروں کا علاج کرنے کے لیے ہم سب کے اندر ایک ڈاکٹر بیٹھا ہوا ہے۔

اپنے دادا جان کے بارے میں ہم نے سُنا ہے کہ ایسی کوئی بیماری نہ تھی جس سے
ان کا واسطہ نہ پڑا ہو۔ گٹھیا ان کو ہوا آنکھوں میں موتیا اُن کی اُترا، ریڑھ کی ہڈی ان کی ٹیڑھی
ہوئی، سر درد، پیٹ درد، نزلہ، زکام تو خیر ان کے زر خرید غلام تھے جو سر جھکائے ہمیشہ
ان کے ساتھ ساتھ چلے، پھر بھی زندگی کی راہ پر نوّے سال تک گامزن رہے اور زندگی بیماریوں
سے نبٹتے اور دوسرے مریضوں کو مشورہ دیتے گزار دی۔ موت ان کی دل کے دورے
سے ہوئی لیکن اُس کے متعلق بھی دو رائیں ہیں۔ کہتے ہیں جب انھیں دل کا دورہ پڑا تو ان کے
ایک عزیز ڈاکٹر کو بُلا لائے۔ ڈاکٹر جب ان کا معائنہ کر رہا تھا تو اسے چھینک آگئی۔ بزرگوار نے
بجھے ہوئے چہرے سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں کہا: "بیٹا ڈاکٹر، تمھیں زکام ہو رہا
ہے ابھی سے اس کی فکر کرو گھر جا کر کچھ گریاں بادام کی اور خشخاش کے بیس دانوں کو ایک
ساتھ پیس کر اور ان میں تھوڑی چینی ملا کر گرم دودھ کے ساتھ پھانک لینا، یقیناً شفا

ہوگی۔ یہ کہہ کر وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق تو وہ دل کے دورے کی وجہ سے گئے لیکن کچھ رشتہ داروں کا خیال ہے کہ وہ آخری مشورہ دینے کی کوشش کی تاب نہ لا سکے۔ گویا یہ ان کا واحد مشورہ تھا جو قیمتی ثابت ہوا۔ ورنہ وہ زندگی بھر مفت مشورے بانٹتے رہے۔

بیماری کے بعد زندگی کا شعبہ جس میں سب سے زیادہ مشورے دیے اور لیے جاتے ہیں وہ محبت ہے۔ کسی نوجوان کو کسی حسینہ نے جوں ہی نگاہِ غلط انداز سے دیکھا تو وہ بجائے اس حسینہ کا پیچھا کرنے کے، کسی سے مشورہ لینے کے لیے نکل جاتا ہے۔ مشورہ دینے والے بھی اسے مایوس نہیں کرتے۔ آزمودہ در آزمودہ نسخے بتائے جاتے ہیں کوئی اسے داغ کے اشعار زبانی یاد کرنے کا مشورہ دے رہا ہے تو کوئی اسے عشقیہ خط لکھنے کے نسخے بتا رہا ہے کوئی اسے عاشقانہ لباس کے ڈیزائن بتا رہا ہے تو کوئی اسے بال سنوارنے کے نئے انداز سکھا رہا ہے۔ دوسروں کا تو ہمیں پتہ نہیں لیکن ذاتی تجربہ ہمارا یہ ہے کہ جب ہم عشق کرنے کے مشورے اکٹھے کر رہے تھے محبوب کو کوئی اور لے اڑا۔ ویسے تو بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ فائدے میں ہم ہی رہے لیکن اُس وقت بہت دُکھ ہوا تھا۔ دکھ اِس بات کا نہیں کہ محبوب سے وصال نہ ہوا بلکہ اِس بات کا کہ ان مشوروں کا کیا کریں جو ہم نے اکٹھے کر لیے تھے۔

ویسے تو ایسا بہت ہی کم ہوا ہے کہ محبت میں کبھی کوئی مشورہ فائدہ مند ثابت ہوا ہو لیکن ہم کم از کم ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جس نے کسی کے مشورے کی بنا پر شادی کی جو بہت کامیاب ثابت ہوئی جب ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ مشورہ کیا تھا تو اُس نے جواب دیا: "مشورہ یہ تھا کہ اِس لڑکی سے شادی کر لو، زندگی بھر خوش رہو گے" ہم نے جب پوچھا کہ یہ مشورہ اُسے دیا کس نے، تو اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اِسی لڑکی نے"۔

یہ درست ہے کہ ایسا خوشگوار مشورہ زندگی میں ہمیں نصیب نہ ہوا لیکن ویسے مشورے ملے بہت۔ ہمارے ایک بزرگ تو کوئی بھی بات کرنے سے پہلے کہا کرتے تھے کہ بیٹا ہماری بات پلّے باندھ لو، کام آئے گی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے اُن کے اِس مشورے پر کبھی عمل نہ کیا ورنہ آج ہمارے پلّے سوائے ان کے مشوروں کے اور

پکھ نہ ہوتا۔

تیسرا میدان جہاں مشوروں کی بہتات ہے وہ ہے سیاست کا میدان۔ سیاست داں چاہے وہ حکومت میں ہو یا حکومت سے باہر، مشوروں سے بچ نہیں سکتا۔ یوں تو سیاست دانوں کو مفت مشورے دینا ہر شہری اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن خصوصی طور پر یہ اخبار نویسوں کا حق سمجھا جاتا ہے کچھ اخبار نویسوں نے جب دیکھا کہ سیاست داں اُن کے مشوروں پر عمل نہیں کر رہے تو وہ بہ نفس نفیس سیاست کے میدان میں کود پڑے۔ کئی تو اس طرح کودے کہ ہڈی پسلی برابر ہو گئی۔ لیکن کئی اس طرح کودے جیسے ایک ماہر بازی گر کودتا ہے یعنی کئی چھوٹی اور بڑی چھلانگیں لگاتے لگاتے وہ پارلیمنٹ کے اندر آگرے۔ اب جب ان کے اخباری دنیا کے پرانے ساتھی انھیں مشوروں سے نوازتے ہیں تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں کہ میں خود دل و دماغ رکھتا ہوں، مجھے کسی کا مشورہ نہیں چاہیئے۔

جیسے کہ آپ جانتے ہیں پچھلے کچھ سالوں میں ڈاکٹری علاج میں ایک اہم تبدیلی ہوئی ہے۔ آج کل ایک مریض کو ایک ڈاکٹر نہیں دیکھتا بلکہ ایک مریض کے لیے چار پانچ ڈاکٹروں کو بلا لیا جاتا ہے اور پھر علاج ان کی متفقہ رائے سے کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی اس ٹولی کو اردو زبان میں ہم مشاورت کمیٹی کہہ سکتے ہیں۔

آہستہ آہستہ مشاورت کمیٹی کا رواج اور شعبوں میں بھی ہو گیا ہم دیکھ رہے ہیں کہ اکثر اردو رسائل میں مدیر کے علاوہ مجلس مشاورت کے زیر عنوان دس پندرہ دانشوروں کا نام ہوتا ہے اس کا مقصد شاید قارئین کو یقین دلانا ہوتا ہے کہ رسائل کی ترتیب میں ان دانشوروں نے مشورہ دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رسالہ پڑھنے کے بعد اکثر احساس ہوتا ہے کہ یا تو ان دانشوروں کا نام اُن کی اجازت کے بغیر رسالے میں شامل کر لیا گیا ہے یا پھر اُن کی دانشوری مشکوک ہے۔

مجلس مشاورت کا رواج البتہ سرکار کے کام میں بہت دیر سے رائج ہے آپ نے اکثر پڑھا یا سنا ہو گا کہ سرکار نے فلاں کام کے لیے ایک ایڈوائزری کمیٹی یا مجلس مشاورت بنائی ہے اکثر ہمارا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس طرح کی ایک میٹنگ میں جا کر دیکھیں کہ یہ مجلس مشاورت کیسے مل بیٹھ کر پیچیدہ مسئلوں کا حل ڈھونڈتی ہے کیونکہ ہمارے ملک میں

تو رواج ہے کہ جہاں چار شخص اکٹھے ہوئے چار نقطہ ہائے نظر پیدا ہو گئے ہم خود چھ بھائی ہیں اور آپس میں اچھا خاصا یارانہ ہے لیکن جب بھی کسی مسئلے کو سلجھانے بیٹھتے ہیں تو فوراً چھ حصوں میں بٹ جاتے ہیں ہمیں یاد ہے ایک بار کسی مسئلے پر بات چیت کرتے ہوئے ہم پانچ بھائی اپنا اپنا نقطہ نظر بتا چکے تو چھٹا اور آخری تقریباً بسورتے ہوئے کہنے لگا کہ چونکہ اس اشوع کا کوئی اور نقطہ نظر ہے ہی نہیں تو مجبوراً مجھے آپ میں سے کسی ایک کی رائے سے اتفاق کرنا ہوگا۔

ملازمت میں گھٹنے رگڑتے رگڑتے ہم بھی ایک ایسی پوزیشن پر پہنچ گئے جہاں ہمیں ایک ادارے کی مجلس مشاورت کا رکن بنا دیا گیا۔ ہمیں پتہ بھی نہیں تھا کہ جس ادارے کی مجلس مشاورت کے ہم رکن ہیں۔ وہ کرتا کیا ہے ہم نے سوچا جا کر تو دیکھیں، اور کچھ نہ ہوا تو باقیوں کی ہاں میں ہاں تو ملا ہی لیں گے۔

وہاں پہنچے تو بہت سے لوگ ایک بڑے ہال میں جمع تھے جہاں انھیں آرام دہ کرسیوں پر بٹھا کر چائے سے ان کی تواضع کی جا رہی تھی۔ چائے میں سامان اتنا تھا کہ کھا لینے کے بعد اگلے دو دن گھر میں چولھا جلانے کی ضرورت نہ تھی جب ہم سب پیٹ بھر کر کھا چکے تو ادارے کا ایک شخص ہاتھ میں بہت سے لفافے لے کر آیا۔ ہر ایڈوائزر سے سرگوشی میں کچھ پوچھتا اور پھر اسے ایک لفافہ تھما دیتا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی طرح پتہ چل جائے کہ سوال کیا پوچھ رہا ہے تاکہ جواب پیشگی تیار کر لیا جائے، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ آخر کار وہ ہمارے پاس آ پہنچا اور پوچھا "آپ کس طرح تشریف لائے ہیں"۔ ہم نے رعب گانٹھنے کے ارادے سے کہا "سرکاری کار میں آیا ہوں"۔ وہ مسکرا کر آگے نکل گیا۔ ہمیں اس نے کوئی لفافہ نہ دیا۔ ہم نے سوچا شاید بھول گیا ہے، اس لیے اُسے واپس بلا کر پوچھا "صاحب آپ مجھے لفافہ دینا بھول گئے ہیں"۔ اُس نے جواب دیا "لفافے صرف ان کو دیے جا رہے ہیں جو ذاتی ٹرانسپورٹ میں آئے ہیں"۔ میں نے فوراً پینترہ بدل کر کہا "معاف کیجیے میرے منہ سے "اسٹاف کار" نکل گیا۔ میں بھی باقیوں کی طرح ذاتی کار میں آیا ہوں"۔ یہ سن کر اُس نے ایک لفافہ مجھے بھی تھما دیا۔

میٹنگ میں کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں کیونکہ میں اُس وقت پتلون کی جیب میں رکھے اس لفافے کے اندر میں پڑے نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ تالیوں کی شور سے پتہ چلا کہ میٹنگ

ختم ہو گئی ہے۔

باہر آکر اچھی طرح نوٹوں کو گنا تو مجھے احساس ہوا کہ مشاورت کمیٹی بڑے کام کی چیز ہے اگر مہینے میں چار ایسی میٹنگوں میں شامل ہو سکوں تو مہنگائی کے اس زمانے میں بھی ذاتی کار کے پٹرول کا خرچ نکل سکتا ہے۔

چنانچہ اس مضمون کے ذریعے ہم اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بخوشی کسی بھی مجلسِ مشاورت میں شامل ہونے کو تیار ہیں، مشورہ تو ہمارا مفت ہو گا، بس چائے پانی اور آنے جانے کے خرچ کا خیال کر لیجیے گا۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں

امریکہ میں آج کل ایک کتاب کا بہت چرچا ہے۔ کتاب کا نام ہے "آخری سفر" اور اس کے مصنف کا نام ہے ڈیرک ہمفری۔ کتاب کی اشاعت کے بعد دو ہی ہفتوں میں اُس کی بیس ہزار کاپیاں بک گئیں لیکن خریداروں کا رش کم نہیں ہوا۔ پبلیشر کا اندازہ ہے کہ اِس کتاب کی کم از کم ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوں گی۔

کتاب نہ کوئی ناول ہے اور نہ افسانوں کا مجموعہ۔ کتاب کے نام سے شک ہوتا ہے کہ شاید سفرنامہ ہو لیکن سفرنامہ بھی نہیں ہے۔ اس کتاب کے بارے میں نہ تو اخبارات میں اشتہار چھپے اور نہ ریویو لکھے گئے پھر بھی کتاب کا اِس طرح بِک جانا حیرانی کی بات نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

کتاب کا نفسِ مضمون جاننے کے بعد آپ کی حیرانی اور بھی بڑھ جائے گی۔ یہ کتاب ایک طرح کا ہدایت نامہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کامیابی سے خودکشی کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اُس نے یہ کتاب اُن لوگوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی ہے جو زندگی سے تنگ آچکے ہیں اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہیں لیکن اللہ میاں کی طرف سے انھیں روانگی کا ٹکٹ موصول نہیں ہو رہا۔ کتاب ایک طرح کا مشورہ ہے اُن لوگوں کے لیے کہ بھائی ٹکٹ کا انتظار کب تک کرو گے۔ بغیر ٹکٹ کے گاڑی پر سوار ہو جاؤ، کوئی آپ کو روکے گا نہیں۔ اگر اِس سلسلے میں کوئی دقّت ہو تو ہمیں بتاؤ۔ ہم آپ کو گاڑی پر سوار ہونے کے ایسے نسخے

بتائیں گے کہ کوئی چیکر آپ کو پکڑ نہ سکے۔

میرے خیال میں یہ کتاب ایک اشد ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ میں نے امریکہ میں تین چار سال گزارے ہیں۔ وہاں کے شہروں میں بوڑھے بوڑھیاں بھرے پڑے ہیں۔ وجہ اس کی یہ بتائی جاتی ہے کہ امریکہ نے تقریباً ہر قسم کی بیماری کی دوا ڈھونڈ لی ہے۔ یہ تو نہیں ہے کہ اُن کی دواؤں سے بیماریاں جڑ سے چلی جاتی ہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ مریض کھاٹ نہیں پکڑتا۔ بیماری کو یوں ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے جیسے ہمارے ہاں کئی بزرگ کسی شریر پوتے کو انگلی لگائے پارکوں میں گھماتے رہتے ہیں۔ وہاں کے بوڑھے بوڑھیاں بیماری کو انگلی لگائے ہوٹلوں میں کھانا کھلانے لے جاتے ہیں، ساحل سمندر پر سیر کرانے لے جاتے ہیں، دوسرے ملکوں کے سفر پر لے جاتے ہیں۔ اس طرح بوڑھے بھی خوش رہتے ہیں اور بیماری بھی خوش کہ ایک اچھے نیک دل انسان سے واسطہ پڑا۔

ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مرنے کی خواہش کس لیے ؟ میرے خیال میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی کتنی بھی حسین ہو، آدمی کا اکتا جانا تو لازم ہے۔ وہاں کا بزرگ اکثر سوچتا ہے کہ بہت کھا لیا، بہت پہن لیا، بہت دیکھ لیا، بہت سونگھ لیا، اب چلیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُن کے قبرستان اتنے حسین، صاف ستھرے اور سایہ دار ہیں کہ خواہ مخواہ وہاں جا کر بسنے کو جی چاہتا ہے۔ میں خود ایک مرتبہ ایک ہندستانی دوست کو ایسے ہی ایک قبرستان میں دفنانے لے گیا تھا۔ میرے ساتھ بہت سے ایشیائی تھے۔ جب تمام رسوم ادا ہو چکیں تو میں نے اُن سے کہا کہ آؤ چلیں۔ جس طرح وہ لوگ بادلِ نخواستہ وہاں سے رخصت ہوئے اُس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ میں انھیں ایک اچھی جگہ سے اُٹھا کر پھر اُن گھروں میں لے جا رہا ہوں جہاں پھر سے اُنھیں زندہ رہنے کی خواہش سے پیدا شدہ پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔

کتاب کا جب بہت چرچا ہوا تو میرے ایک پبلشر دوست رام لال مجھے ملنے آئے اور کہنے لگے "سنتے ہیں آج کل امریکہ میں ایک کتاب کا بہت چرچا ہے"۔ رام لال ہمیشہ سنتے ہیں، پڑھتے نہیں ہیں۔ ویسے تو یوں بھی وہ کم پڑھے لکھے آدمی ہیں لیکن اصولاً بھی

وہ پڑھنے لکھنے کو بینائی پر خواہ مخواہ کا بوجھ سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا "رام لال جی آپ کی تعلیم اتنی کم ہے، آپ اخبار کیسے نکالیں گے؟" کہنے لگے "میں صرف اخبار نکالنا چاہتا ہوں، خود پڑھنا تو نہیں چاہتا۔"

جوں ہی رام لال جی نے "آخری سفر" کے بارے میں سنا انھیں محسوس ہوا کہ پیسے کمانے کا یہ نسخہ انھیں بھی آزمانا چاہیئے چنانچہ مجھ سے مشورہ کرنے چلے آئے۔

رام لال جی کہنے لگے "بوڑھے تو ہمارے ہاں بھی بہتیرے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ بھی آخری سفر پر روانہ ہونے کے لیے بیتاب ہوں۔ کیوں نہ ہم انھیں اس سفر پر روانہ کرنے کے لیے اُن کی مدد کریں۔"

میں نے کہا "بظاہر تو آپ ٹھیک کہ رہے ہیں لیکن پھر بھی اس کتاب کی اشاعت پر پیسا لگانے سے پہلے تھوڑی چھان بین کرلیں تو اچھا ہوگا" کہنے لگے یہ جو آپ کی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی عادت ہے اس کی وجہ سے آپ چلتے کم ہیں اور پھونکتے زیادہ ہیں۔ لیکن اب چونکہ آپ سے مشورہ مانگ ہی لیا ہے اس لیے تھوڑی بہت بات آپ کی ماننی ہی پڑے گی۔ چلیے۔"

چنانچہ ہم دونوں بوڑھوں کی تلاش میں نکل پڑے۔

سب سے پہلا بوڑھا جو ہمیں نظر آیا وہ ایک بنک کی طرف جارہا تھا۔ چال اُس کی کچھ اس قسم کی تھی کہ جب وہ ایک قدم آگے بڑھاتا تھا، خود بخود دو قدم پیچھے ہوجاتا تھا۔ آنکھوں پر جو عینک تھی اُس کا نمبر وہ تھا جس کے آگے کوئی اور نمبر نہیں ہوتا۔ پتلون جو اُس نے پہن رکھی تھی اُس کو ایک موٹی رسّی نے اُس کی کمر کے اردگرد پکڑ رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ پتلون کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھا کہ اُس کے نیچے گر جانے کا خطرہ تھا۔

رام لال نے اُسے دیکھا تو اُسے وہ اپنی کتاب کا گاہک نظر آیا۔ کیونکہ عمر کی جس منزل پر وہ تھا اُس کے آگے بس ایک ہی منزل تھی۔ جہاں پہنچنے کے لیے یہ کتاب سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے پوچھا "رام لال یہ شخص بنک کس لیے جارہا ہے؟"

کہنے لگا "یقیناً پیسے نکلوانے جا رہا ہے کہ آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹانا چاہتا ہے۔"

ہم دونوں اُس کے پیچھے ہو لیے کہ جب وہ پیسے نکلوائے گا، ہم اُسے اپنی اسکیم سے خبردار کر دیں گے۔

بینک پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ وہ فکسڈ ڈیپازٹ کے کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے ڈیپازٹ کو ری نیو کر دیجیے۔

کلرک نے پوچھا "کتنے سال کے لیے؟"

"فی الحال پانچ سال کے لیے کر دیجیے" بزرگ نے جواب دیا۔

رام لال میرا بازو تھامے مجھے بینک سے باہر لے آیا اور کہنے لگا "دنیا امید پر قائم ہو یا نہ ہو لیکن یہ بوڑھا جس امید پر قائم ہے اُس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آؤ چلیں۔"

ایک اور بزرگ کو ہم نے دیکھا جو ایک ڈاکٹر کے کلینک میں داخل ہو رہا تھا۔ رام لال نے پوچھا "بزرگوار کیا تکلیف ہے؟"

کہنے لگا "کوئی ایک تکلیف ہو تو بتاؤں؟ آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے دونوں گردوں میں پتھری ہے، پیٹ میں رسولی ہے۔ نبض اس طرح چلتی ہے جیسے اُسے مجھ سے پہلے کہیں پہنچنا ہو۔"

رام لال کو بزرگ کی صورت میں کتاب کا خریدار نظر آیا تو کہنے لگا: "اتنی بیماریوں کا علاج کراتے کراتے آپ لٹ جائیں گے۔ اب تو آپ کو چاہیے کہ اگلی دنیا کے سفر کا سوچیں۔"

بزرگ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہنے لگا "کیسے سوچوں بیٹا۔ یہاں ابھی کئی ذمہ داریاں ہیں میرے سر پر۔ ایک لڑکی کنواری بیٹھی ہے۔ ایک لڑکا ابھی ڈھنگ سے کوئی کام دھندا نہیں کر رہا۔"

"ارے صاحب یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ آپ نہیں ہوں گے تو اپنے آپ گھر کے لوگ اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں گے۔"

"کیسے سنبھال لیں گے بھائی۔ میں نہ ہوں تو سویرے دودھ کی لائن میں کھڑا ہونے

کو کوئی تیار نہیں۔"

میں اور رام لال وہاں سے یہ سوچتے ہوئے کھسک گئے، کہ جب تک سرکار دودھ کی تقسیم کا کام مناسب ڈھنگ سے نہیں کرتی کہ اُس کو خریدنے کے لیے لائن میں کھڑا نہ ہونا پڑے یا پھر بزرگوار کے گھر کے لوگ دودھ پینے کی سٹیج سے آگے نہیں نکل جاتے یہ ہماری کتاب کا گاہک نہیں بن سکتا۔

اِس کے بعد رام لال مجھے اپنے گھر کی طرف لے گیا۔ کہنے لگا "میرے پڑوس میں ایک بڑھیا رہتی ہے جو دن رات اپنی بہو سے گالیاں کھاتی ہے۔ وہ یقیناً اس دنیا سے ہجرت کی دُعائیں مانگتی ہوگی۔

ہم جب وہاں پہنچے تو بڑھیا رام دلاری کہ یہی اُس کا نام تھا، اپنی بہو سے ڈانٹ کھا رہی تھی۔ بہو جب گالیاں دے دے کر تھک گئی تو اپنے اسکوٹر پر سوار ہو کر گھر سے باہر چلی گئی۔ رام لال موقعہ مناسب دیکھ کر فوراً بڑھیا کے پاس پہنچا اور کہا "اماں یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ روز اپنی بہو سے گالیاں کھاتی ہو" بڑھیا نے جواب دیا "مرجانیاں، اپنی ہی بہو سے کھاتی ہوں، کسی دوسرے کی بہو سے تو نہیں کھاتی۔"

رام لال نے ہار نہیں مانی۔ کہنے لگا "گھر کا سارا کام کرتی ہو۔ تیرا بیٹا اور بہو دفتر چلے جاتے ہیں تو اُن کے بچے کو نہلاتی ہو، کھلاتی ہو لیکن اس کا معاوضہ تمہیں کیا ملتا ہے؟ گالیاں اور ٹھوکریں۔ چل اس دنیا سے کنارہ کر۔ راستہ میں تجھے بتاتا ہوں۔

"نالائق میں اگر چلی جاؤں تو میرے پوتے کا کیا بنے گا؟" یہ دونوں جب دفتر چلے جائیں گے تو وہ نوکروں کے ہاتھوں پلے گا۔ یہ کیا اچھی بات ہوگی۔"

"لیکن تیری بہو تجھے کوستی رہتی ہے۔"

"ہاں لیکن اس مورکھ کی وجہ سے میں اپنے پوتے کی زندگی برباد نہیں کرسکتی اور پھر رام لال بہو ساس میں تو چلتی ہی رہتی ہے۔ میں نے اپنی ساس کو کون سا کم تنگ کیا تھا۔" یہ کہہ کر بڑھیا ہنسنے لگی۔

"مطلب یہ کہ تو اس دنیا سے جانا نہیں چاہتی؟"

"کس لیے جانا ہے بھائی۔ میرا بیٹا ہے، میری بہو ہے، میرا پوتا ہے۔ لوگ ان

نعمتوں کو ترستے ہیں۔ اور مجھے یہ سب میسّر ہے۔ میرا پوتا بڑا ہو گا تو اس کی شادی کروں گی۔ اس کی بہو کو وہ ہار پہناؤں گی جو میری ساس نے مجھے شادی کے موقع پر دیا تھا۔ یہ بچّہ مجھ سے بڑا ہی پیار کرتا ہے۔ ابھی کل ہی میرے سر میں راکھ ڈال کر کہہ رہا تھا۔ دادی تیرے سفید بال رنگ دار ہو گئے ہیں۔ میں اس بات پر بہت دیر تک ہنستی رہی۔"

"تمھارا اگلے پڑاؤ کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں بس منّے کی شادی ہو جائے پھر بلاوا آیا تو چلی جاؤں گی۔"

"تب تک بہو سے گالیاں کھاتی رہو گی؟"

"تو بھی پگلا ہے۔ سال ہی کتنے رہ گئے ہیں منّے کی شادی میں۔ تین سال کا تو ہو گیا ہے اٹھائیس کا ہو گا تو شادی کر دیں گے۔ کل پچیس سال کی تو بات ہے۔"

ہم دونوں شکست خوردہ باہر نکل آئے۔

میں نے رام لال کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے کہا "شکر ہے تم نے وہ کتاب شائع نہیں کی۔ خواہ مخواہ نقصان ہوتا۔" کہنے لگا۔ "میں اپنی نہیں سوچ رہا۔ میں اُس امریکن پبلشر کی سوچ رہا ہوں۔ اگر اُس نے یہ کتاب ہمارے دیش میں شائع کی ہوتی، تو وہ آج بھوکا پیاسا اپنے آخری سفر پر نکل گیا ہوتا۔

اپنا کندھا اپنی لاش

میرے دفتر میں ایک افسر تھے چکرورتی ۔ آج سے چھے سال پہلے جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو میرا تقرر اُن کی جگہ ہوگیا۔ انھوں نے سبکدوشی کے بعد ایک سرکاری کالونی میں چھوٹا سا مکان بنایا جہاں وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہنے لگے۔ میری اکثر ان سے فون پر بات چیت رہتی ہے۔ جب کبھی کوئی پُرانی فائل نہ ملے تو میں انھی سے پوچھا کرتا ہوں ۔کسی کیس کی نوعیت میری سمجھ میں نہ آئے تو میں ان سے مشورہ کرتا ہوں انھیں بھی اپنی پنشن کے سلسلے میں اپنے پرانے دفتر سے کچھ کہنا سننا ہو تو مجھے ہی فون کرتے ہیں۔ باہمی مفاد کی وجہ سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے۔

ایک دن انھوں نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ اُن کی بوڑھی ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے فوراً وہ تمام جملے جو ایسے موقع پر بولے جاتے ہیں، بولنے شروع کردیے یعنی اُن کے دکھ میں میں برابر کا شریک ہوں۔ ماں کے سایے سے محروم ہوکر زندگی کی دھوپ برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بھگوان مرحومہ کو سورگ میں جگہ دے، وغیرہ۔ انھوں نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا ”یار جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ اپنی جگہ درست سہی لیکن اِس وقت یہ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ میں نے فون تمھیں تعزیت وصول کرنے کے لیے نہیں کیا، بلکہ مدد حاصل کرنے کے لیے کیا ہے۔

میں نے کہا” فرمائیے “

کہنے لگے :” یار دفتر سے تین چار کلرک بھیج دو، ماتاجی کو شمشان لے جانا ہے “

میں ان کی درخواست سن کر چکرا گیا۔ جب ذرا سنبھلا تو کہا :” سر مرنے والے کو شمشان

لے جانے کے لیے تو عام طور پر رشتے دار کام میں لائے جاتے ہیں۔"
کہنے لگے "جانتا ہوں۔ لیکن دلّی میں میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"
"اور پڑوسی؟" میں نے پوچھا۔
کہنے لگے "ماتا جی کچھ ایسے بے وقت پر لوک سدھاری کہ سب پڑوسی دفتروں کے لیے نکل چکے ہیں۔ اِس وقت پوری کالونی میں میں اکیلا مرد ہوں اور ماں کو شمشان لے جانے کے لیے کم از کم چار مردوں کی ضرورت ہے۔ اِسی لیے تم سے درخواست کر رہا ہوں۔ یوں تو ماں کا وزن اتنا کم ہے کہ میں اکیلا بھی انھیں اٹھا کر لے جا سکتا ہوں لیکن اِس طرح پہلے کوئی لاش شمشان کے لیے نہیں گئی۔ اس لیے شاید مناسب نہ لگے۔
میں نے کلرک بھیج کر چکرورتی کا کام کروا دیا۔ لیکن میرے دل میں ایک وسوسہ سا بیٹھ گیا کہ جب ہمارا شمشان جانے کا وقت آئے گا اور اگر کسی وجہ سے کلرک نہ ملے تو ہماری لاش شمشان کیسے پہنچے گی۔
میں نے جب چکرورتی صاحب سے اس مسئلے پر بات کی تو کہنے لگے: "بدلتے ہوئے حالات میں تمھیں خود چل کر شمشان جانا ہوگا۔"
میں نے کہا: "مردے کا خود چل کر شمشان جانا کچھ ناممکن سا لگ رہا ہے۔"
کہنے لگے: "اس لیے لگ رہا ہے کہ اِس مسئلے پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا۔ غور کرو گے تو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے بھیّا۔ یہ سیلف سروس یعنی خود کرنے کا زمانہ ہے۔ ہوٹلوں میں گاہک خود اپنی پلیٹوں میں کھانا ڈال کر کھا رہے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں خود ہی نل خراب کر رہے ہیں اور خود ہی ٹھیک کر رہے ہیں۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی اپنے وَر خود تلاش کر رہی ہیں، تو مردہ شمشان تک خود کیوں نہیں جا سکتا۔ مجھے تو افسوس ہے کہ یہ ہمارے زمانے میں نہ ہوا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: "کیا آپ کئی سال پہلے شمشان جانے کی سوچ رہے تھے" کہنے لگے میں شمشان جانے کی نہیں، رشتے ڈھونڈنے کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیے نا ہمارے زمانے میں رشتہ ڈھونڈنا والدین کا کام تھا۔ چونکہ میرے والدین یہ فرض نبھانے میں نااہل ثابت ہوئے، اس لیے میں کنوارا رہ گیا۔
میں نے کہا چکرورتی صاحب رشتے کی بات تو اِس وقت نہ چھیڑیے کہ آپ عمر کی جس منزل پر ہیں۔ رشتے کی بات بے وقت کی راگنی لگتی ہے۔ اب تو آپ اپنے مردے

کو شمشان پہنچانے کی فکر کیجیے ۔" کہنے لگے : " میں تو کر ہی رہا ہوں ۔ آپ بھی ادھر دھیان دیجیے ۔ ورنہ آپ کا مردہ گھر میں ہی پڑا رہ جائے گا اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے ۔"

میں نے بہتیر ا دھیان دیا لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے مردے کو خود شمشان کیسے پہنچایا جا سکتا ہے ۔ کسی نے مشورہ دیا کہ جب آپ کو موت کا فرشتہ دکھائی دینے لگے شمشان کی طرف دوڑ پڑے ۔ اس تجویز میں قباحت مجھے یہ نظر آئی کہ موت کا فرشتہ پولیس کا انسپیکٹر تو ہے نہیں کہ آپ نے کہا "حضور ذرا سی مہلت دیجیے میں کپڑے بدل کر آپ کے ساتھ چلتا ہوں ۔" عام طور پر وہ مان جاتا ہے اور اگر نہ مانے تو اُسے منانے کا ایک ایسا نسخہ ہے جو سب کو معلوم ہے ۔ لیکن ملک الموت تو کہتے ہیں ایک سیکنڈ کی مہلت بھی نہیں دیتا ۔

کسی نے مشورہ دیا "شمشان والوں سے بات کرو ، وہ ضرور کوئی راستہ بتا دیں گے ۔"

میں جب شمشان پہنچا تو وہاں ایک کونے میں چار پانچ پنڈے سلفہ پی رہے تھے ۔ باقی شمشان میں شمشان کی سی خاموشی تھی ۔

میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا : " میں اپنے کندھے پر سوار ہو کر شمشان پہنچنا چاہتا ہوں کوئی نسخہ بتائیے ۔" ایک پنڈے نے پوچھا "آپ کی موت کب تک واقع ہوگی" میں نے کہا موت کا کیا ہے کسی وقت بھی آ سکتی ہے ۔ شاید کل ہی آ جائے ۔ کہنے لگا " اگر یہ بات ہے تو اپنے کریہ کرم کا خرچ ہمارے پاس جمع کروا دیجیے اور رات یہیں ہمارے ساتھ گزاریے ۔ کل بھگوان کی دیا سے آپ کا کریہ کرم اِس طرح کریں گے کہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی ۔ میں نے پوچھا "کتنا خرچ" ۔ کہنے لگا "یہ تو آپ پر منحصر ہے ۔ کریہ کرم پانچ سو روپوں میں بھی ہو سکتا ہے اور پانچ ہزار میں بھی ۔ صرف اتنا یاد رکھیے کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا ۔"

مجھے یہ مثال کچھ غیر مناسب سی لگی ۔ لیکن اُس وقت ادب کے مسائل پر بحث کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا ۔

میں نے پوچھا : " اگر میری موت کل تک نہ ہوئی تو ؟ "

کہنے لگے " ایک آدھ دن اور صبر کر لیں گے ۔ لیکن اِس سے زیادہ نہیں ۔ یہ شمشان ہے کوئی دھرم شالہ نہیں ہے ۔"

میں نے کہا " آپ غلط سمجھے ۔ میرا ارادہ شمشان میں پڑے رہنے کا بالکل نہیں ہے ۔

میرا تو مطلب صرف اتنا ہے کہ مجھے اپنے کریہ کرم میں کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ یوں لگنا چاہیے جیسے میں اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھا کر لایا ہوں۔ میں نے ہی اپنی چتا کو آگ دی ہے۔ میں نے ہی منتر پڑھے ہیں۔ میں نے ہی اپنی موت پہ آنسو بہائے ہیں۔ اور میں ہی اپنے پھول گنگا جی میں بہا کر آیا ہوں۔

ایک اور پنڈا سلفے کے نشے سے ایک منٹ کے لیے ابھرا اور کہنے لگا "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ آپ سیلف سروس فیونرل چاہتے ہیں جیسے کہ آج کل امریکہ میں ہو رہا ہے۔

میں نے پوچھا "مہنت جی آپ کبھی امریکہ گئے ہیں"۔

کہنے لگا "گیا ہوں تبھی تو جانتا ہوں"۔

میں نے پوچھا "کس سلسلے میں گئے تھے"۔

کہنے لگا "مردہ ہی جلانے گیا تھا" کوئی کمپیوٹر بنانے تھوڑے ہی گیا تھا۔ کوئی امیر ہندستانی وہاں مر گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ سورگ کے سفر پہ روانہ ہو تو کوئی ہندستانی پنڈا ہی اسے رخصت کرے۔ چنانچہ ٹکٹ بھیج کر مجھے بلوایا گیا۔ وہیں مجھے پتہ چلا کہ امریکہ میں آج کل سیلف سروس فیونرل کا رواج چل پڑا ہے۔ ہوتا اس میں یوں ہے کہ مرنے والا کفن دفن کی فرم میں ایک طے شدہ رقم جمع کروا دیتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد فرم والے اس کے کفن دفن کی مکمل ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتے ہیں۔ قبر وہ کھدوائیں گے، کفن وہ سلوائیں گے۔ مرحوم کی خوبیاں گنوانے والی تقریر وہ لکھوائیں گے، وہی پڑھوائیں گے۔ آپ اپنے بارے میں کچھ اس طرح کا انتظام کرنے کی تو نہیں سوچ رہے؟"

"بالکل یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا یہاں کوئی ایسی فرم ہے؟"

"فرم تو شاید نہیں ہے لیکن فرم کھولنے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ مردے تو ہم نے بہت جلائے ہیں لیکن مردے جلانے کا بزنس آج تک نہیں کیا۔ اب یہ بھی کر دیکھتے ہیں"۔

میں نے پوچھا خرچ کیا ہوگا۔

کہنے لگا "پانچ ہزار روپے جمع کروا دیجیے۔ آپ پہلے گاہک ہیں۔ بوہنی کے وقت میں زیادہ نہیں مانگوں گا"۔

میں نے پوچھا "پانچ ہزار روپے میں کیا کیا ہوگا ؟"
کہنے لگا: "آپ کی لاش کو یہاں تک لانا، کفن سلوانا، لاش پر ایک قیمتی شال ڈالنا، جلانے کے لیے لکڑی خریدنا، رونے اور بین کرنے کے لیے عورتوں کا بندوبست کرنا اور جلانے کے بعد آپ کے متعلق ایک تعریفی تقریر۔
میں نے کہا، "رونے پیٹنے کے لیے پرائی عورتیں کچھ اچھی نہیں لگیں گی۔"
کہنے لگا "نہیں صاحب یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ آپ کی بیوی آپ سے لاکھ محبت کرے لیکن سری دیوی کی طرح محبت کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اپنی عورتوں میں وہ سُر تال کہاں جو کرایے کی عورتوں میں ہوگا۔ ہم جو عورتیں آپ کا بین کرنے کے لیے لائیں گے وہ بین کریں گی تو آپ کو یوں لگے گا جیسے راگ کیدارا گایا جا رہا ہے۔ چھاتی پیٹیں گی تو کچھ اس طرح لگے گا جیسے طبلے پر تین تال بج رہا ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شکل وصورت ان کی ایسی ہوگی کہ وہ بالکل رشتے دار عورتیں لگیں گی۔
میں نے سوچا تو پانچ ہزار کا خرچ مجھے کچھ زیادہ نہیں لگا۔
میں نے کہا "ٹھیک ہے مجھے یہ سودا منظور ہے۔ لیکن یہ بتائیے آپ معلوم کیسے کریں گے کہ میں مرگیا ہوں ؟" کہنے لگا "صاحب جب بزنس کھولا ہے تو کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہر روز میرا آدمی آپ کے گھر جا کر دیکھ آیا کرے گا کہ آپ کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا ہے یا نہیں"۔
چنانچہ اُس کا آدمی باقاعدہ صبح آکر مجھے دیکھ جاتا تھا۔ اِس طرح پندرہ دن گزر گئے ایک دن ملازم کی جگہ پنڈا خود آیا۔ اس وقت میں یوگا کر رہا تھا۔ پنڈا پوچھنے لگا:
"کہیے جناب کیا حال ہے"۔
میں نے کہا: "بھگوان کی کرپا ہے"۔
کہنے لگا "آپ پر تو بھگوان کی کرپا ہے لیکن ہمارا دیوالہ پٹ رہا ہے"
میں نے پوچھا "کیسے ؟"
کہنے لگا: کچھ آپ کو پتہ ہے کہ لٹھا کتنا مہنگا ہو رہا ہے ؟"
"لٹھے سے میری موت کا کیا تعلق ؟"
"آپ کی لاش کو لپیٹنا نہیں ہے لٹھے میں کیا ؟ لکڑی دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ گھی کل تک چھیانوے روپے کلو تھا، آج سو روپے کلو ہوگیا ہے۔ مہنگائی آسمان کو چھو

رہی ہے اور آپ ہیں کہ جئے چلے جا رہے ہیں۔"
"اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں خودکشی کر لوں"،
"خودکشی نہ کریے لیکن یہ یوگا ووگا تو بند کریے۔ آپ تو بھگوان کے کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔"

ہماری دونوں کی آپس میں خوب تو تو میں میں ہوئی۔ وہ کہتا تھا اگر مرنا ہی نہیں ہے تو پھر کفن دفن ٹھیک ہی کیوں کیا۔ میں کہتا تھا "آپ نے میری لاش کو ٹھکانے لگانے کا ٹھیکہ لیا ہے۔ لاش میں تبدیل ہونے سے پہلے آپ مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے"۔

مختصر یہ کہ میں جیتا چلا گیا اور لکڑی، گھی، لٹھا، رونے پیٹنے والی عورتوں کا ریٹ بڑھتا چلا گیا۔ ایک دن پنڈے جی آئے تو چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ تقریباً روتے ہوئے پوچھا: "طبیعت کیسی ہے"۔
"ایک دم بڑھیا" میں نے جواب دیا۔

انھوں نے جیب سے پانچ ہزار روپے نکالے اور میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا: "یہ لیجیے اپنے پیسے۔ آج کی قیمتوں کے حساب سے تو اس میں ایک لاوارث لاش بھی جلائی نہیں جا سکتی۔ ہمیں نہیں کرنا گھاٹے کا بزنس۔ خود ہی چلے جانا شمشان۔ خود ہی لکڑیاں خریدنا اور اپنے آپ کو جلا لینا۔ اور اگر ممکن ہو تو جل جانے کے بعد خود ہی غالب کا یہ مصرع دہرا لینا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بھٹکا ہوا مسافر

اُس دن میرے کسی دوست کے گھر پارٹی تھی۔

پارٹی آدھی رات کے قریب ختم ہوئی۔ میں اپنی گاڑی میں اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا۔ چونکہ خاصی دیر ہو گئی تھی اس لیے میری خواہش تھی کہ جلد سے جلد گھر پہنچ جاؤں۔ اپنی سمجھ سے میں نے ایسا راستہ چنا جو مجھے جلد گھر پہنچا سکتا تھا۔ راستے میں ایک بس اسٹینڈ پر میں نے ایک اکیلے شخص کو سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے دیکھا۔ میں نے گاڑی روک کر پوچھا "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" وہ کہنے لگا: "بہت دیر سے یہاں کھڑا ہوں۔ کوئی بس نہیں آ رہی۔ کیا آپ مجھے قطب مینار کے قریب چھوڑ سکتے ہیں؟"

مجھے ترس تو بہت آیا لیکن میں قطب کے بالکل الٹی طرف جا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے معذرت تے ہوئے کہا "میں تو بھائی قطب مینار کے الٹی طرف جا رہا ہوں۔ اگر اُدھر جا... ہوتا تو ضرور چھوڑ دیتا۔" وہ شخص ہنسا اور کہنے لگا "مجھے لفٹ دیجیے یا نہ دیجیے، آپ کی مرضی۔ ویسے جانو آپ اُدھر ہی رہے ہیں۔"

تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے کوئی غلط سڑک لے لی ہے اور میں گھر جانے کی بجائے گھر سے دور جا رہا ہوں۔

میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

زندگی بھر میں کبھی سیدھا راستہ پکڑ نہیں پایا۔ اچھا بھلا جا رہا ہوتا ہوں کہ اچانک کوئی ایسی سڑک لے لیتا ہوں جو مجھے منزل پر پہنچانے کی بجائے منزل سے

دور لے جاتی ہے۔ بالآخر میں منزل مقصود پر پہنچ تو جاتا ہوں لیکن بالکل ایسے جیسے کولمبس امریکہ پہنچ گیا تھا۔

ایسا میرے ساتھ کیوں ہوتا ہے میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔ شاید نئی دلّی کی سڑکیں ایک سی ہیں اور میں اورنگ زیب روڈ کو شواجی روڈ سمجھ لیتا ہوں۔ یا پھر میرے دماغ میں کچھ رگیں اُلجھ سی گئی ہیں اور میں ٹھیک طرح سے سڑکوں کو پہچان نہیں سکتا۔ لیکن یہ اب تقریباً طے ہے کہ دس میل کا سفر طے کرنے کے لیے میں عام طور پر بیس میل گاڑی چلاتا ہوں۔ اور پچاسوں بار دیکھے ہوئے راستوں پر جاتے ہوئے بھی کسی نہ کسی سے پوچھتا ضرور ہوں کہ بھائی صاحب نیشنل اسٹیڈیم کو کون سا راستہ جاتا ہے۔

میری اس صورت حال کو میری بیوی نے ایک بار بڑے اچھے ڈھنگ سے بیان کیا تھا۔ ایک بار ہم دونوں کہیں سے آرہے تھے تو میرے ایک دوست بھی ہماری گاڑی میں سوار ہو گئے کہ انھیں ہمارے ہی علاقے کی طرف آنا تھا: "راستے میں پٹرول کی قیمتوں کا ذکر آگیا تو میرے دوست نے میری بیوی سے پوچھا۔ ایک مہینے میں آپ کا پٹرول پر کتنا خرچ ہوتا ہے؟"

"قریباً تین ہزار روپے"، میری بیوی نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگ کافی سفر کر رہے ہیں"۔

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ جتنا سفر ہم کر رہے ہیں۔ اُس کے حساب سے تو ہمارا خرچ ڈیڑھ ہزار سے اوپر نہیں ہونا چاہیے۔ باقی کا پٹرول میرے خاوند راستہ تلاش کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔"

اِس عادت کی وجہ سے کئی مرتبہ مجھے شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

ٹی وی کی ایک ایکٹرس سے میری بڑی گہری دوستی ہے۔ وہ جس دفتر میں کام کرتی ہے وہ میرے دفتر سے قریب پانچ کلو میٹر دور ہے۔ اکثر وہ لنچ ٹائم میں مجھے ملنے آجاتی ہے۔ ایک مرتبہ واپس جانے کے لیے اُسے آٹو رکشہ نہ مل سکا تو میں نے اُسے اپنی گاڑی میں چھوڑنے کی پیش کش کی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی میں نے اپنے ذہن میں اُس کے دفتر پہنچنے کا نقشہ بنا لیا اور اُس پر روانہ ہو گیا۔ جب آدھ گھنٹہ گاڑی چلانے کے باوجود میں اُس کے دفتر تک نہ پہنچا تو اُس نے بڑے پیار سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"دلیپ جی جن راہوں سے ہو کر آپ میرے دفتر کی طرف جا رہے ہو اُس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ آپ مجھے اغوا کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ لیکن میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آپ شریف آدمی ہیں اور ایسا کوئی کام نہیں کریں گے۔"

یہ نہیں ہے کہ میں صرف کہیں اور جاتے ہوئے ہی راستہ بھولتا ہوں اپنے گھر کو جاتے ہوئے بھی میری یہی حالت ہوتی ہے۔ ابھی پچھلے دن ہی کی بات ہے میں اپنے ایک مزاح نگار دوست کو اپنے ساتھ گھر لے جا رہا تھا۔ بالآخر وہ سڑک آگئی جس پر میرا گھر واقع تھا۔ لیکن میں آگے نکل گیا۔ میرے دوست نے مجھے متوجہ کرتے ہوئے کہا: "آپ کو تو اِدھر مڑنا تھا۔" میں نے کہا "کوئی بات نہیں، آگے سے بھی ایک راستہ ہے۔" کہنے لگا "ہاں راستہ تو ضرور ہو گا۔ ہم نے جغرافیے میں پڑھا ہے کہ آدمی اگر ناک کی سیدھ میں چلتا جائے تو کبھی نہ کبھی وہیں ضرور پہنچ جاتا ہے جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ آپ بھی صبح گھر سے نکلے تھے۔ کبھی نہ کبھی گھر تو پہنچ ہی جائیں گے۔"

اپنے شہر میں اگر آدمی بھٹک بھی جائے تو راستہ بتانے والے لوگ اُسے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں سڑکوں پر کئی لوگ اس طرح کھڑے رہتے ہیں جیسے اُن کی زندگی کا مقصد ہی راستہ بتانا ہو۔ لیکن یورپ میں ایسی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ آپ کو راستہ بتا سکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں ہر شخص حرکت میں ہے۔ راستہ تو وہی بتا سکتا ہے جو ایک جگہ کھڑا ہو اور آپ کی بات سُنے۔ اور تیسری اور سب سے زیادہ کٹھن بات یہ ہے کہ وہ لوگ آپ کی زبان ہی نہیں سمجھتے۔ بظاہر آپ بھی انگریزی بول رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی انگریزی بول رہا ہوتا ہے لیکن لگتا یوں ہے جیسے دونوں ہی کسی غیر زبان میں گفتگو کر رہے ہوں۔

لیکن یہ تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہاں دلّی میں ایک مرتبہ ایک انگریز عورت نے مجھ سے مان سنگھ روڈ کا راستہ پوچھا تھا اور میں نے انگریزی میں ایم۔ اے ہونے کے باوجود اُسے مانسرو ور گارڈن بھیج دیا تھا۔

کچھ سال پہلے جب میں ہندستانی سفارت خانے میں ملازمت کے سلسلے میں اسٹریا کی راجدھانی وی آنا گیا تو مجھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ پہلے دن میں ٹیکسی لے کر دفتر پہنچا تو میرے ساتھی مذاق اڑانے لگے۔ کہنے لگے یار تمھارے ہوٹل سے ہمارا دفتر کل ایک کلومیٹر

کے فاصلے پر ہے، پیدل آجایا کرو۔ میں نے کہا مجھے راستہ نہیں آتا۔ انھوں نے مجھے ایک نقشا دیا اور بتایا کہ اگر یہاں سے چلو تو اِس راستے سے ہوتے ہوئے دفتر پہنچ جاؤ گے۔ یہ بھی بتایا کہ اِن ملکوں میں راستے نقشے کی مدد سے ہی تلاش کیے جاتے ہیں۔ ان کو پڑھنے کی عادت ڈالو۔ میری مدد کے لیے انھوں نے مجھے نقشوں کا ایک پورا سیٹ دے دیا کہ ان کی مدد سے پورا اسٹریا گھوم سکتے ہو۔

اگلے دن نقشے کی مدد سے جب میں دفتر میں پہنچا تو سب بہت خوش ہوئے کہ مجھے نقشا پڑھنا آگیا ہے۔ پھر کسی نے میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا نقشا دیکھا تو کہنے لگا کہ یہ نقشا تو وی آنا کا ہے ہی نہیں۔ یہ تو سالزبرگ کا نقشا ہے۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگا۔ کسی منچلے نے کہا کہ دلیپ سنگھ کی کامیابی کی خوشی میں ایک پارٹی ہو جائے۔ لوگ نیویارک کے نقشے کو دیکھ کر نیویارک گھوم آتے ہیں۔ دلیپ سنگھ نے برلن کا نقشا دیکھ کر نیویارک کی سیر کر لی ہے۔

یہ درست ہے کہ میں راستہ بھولنے کا عادی ہوں لیکن کئی بار میں نے منزل مقصود کو بغیر پتے کے بھی تلاش کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سڑکوں اور گلیوں کی پہچان مجھے نہ سہی لیکن انسانی فطرت کو میں خوب پہچانتا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں تھیٹر کی سرگرمیوں میں مست تھا۔ ڈرامے لکھتا بھی تھا اور ڈائرکٹ بھی کرتا تھا۔ ایک نئی نئی ہیروئن ہمارے گروپ میں شامل ہوئی تھی۔ نام تھا نینا۔ خوبصورت تو خیر تھی ہی، لیکن انداز اُس کے ایسے تھے کہ نوجوان تو نوجوان، بزرگ بھی اپنا کام دھندا بھول کر وہی راہ اپنا لیتے تھے جس پر وہ جا رہی ہو۔

میں کبھی اُس کے گھر تو نہیں گیا تھا لیکن اُس نے اپنا پتا مجھے ضرور بتلایا تھا جسے میں نے بزعم خود دل پر لکھ لیا تھا۔ پتا کچھ اس طرح تھا۔ روڈ نمبر چھے، مکان نمبر ایک ہزار سترہ، کرشن نگر، دلی۔

ایک دن ہمیں اچانک دعوت نامہ ملا کہ اپنا گروپ لے کر پانی پت شو کرنے آجاؤ۔ چنانچہ اُسی شام نینا سے ملنا ضروری ہو گیا۔ میں نے ڈرامے کے ہیرو کو اپنے ساتھ لیا اور کرشن نگر کی طرف چل دیا۔

کرشن نگر تک تو آسانی سے پہنچ گئے لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ روڈ نمبر چھے

تو در کنار، وہاں کوئی روڈ ہی نہیں ہے۔ ہاں البتہ گلیاں ہیں۔ چھے نمبر گلی ڈھونڈی تو اُس میں مکان نمبر ایک ہزار سترہ نہیں تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ دل پر لکھا ہوا پتا صحیح نہیں ہے۔ ہیرو تو چکرا گیا۔ کہنے لگا بغیر پتے کے کیسے ڈھونڈیں گے۔

اُس دوران میری نظر دو لوفروں پر پڑی۔ سر کے بال گردن تک آرہے تھے۔ کالے رنگ کی قمیصوں کے بٹن ناف تک کھلے ہوئے تھے۔ ایک بہت زیادہ چوڑی بیلٹ پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے قریب جاکر پوچھا "بھائی صاحب پتا ہم سے گم ہوگیا ہے۔ کیا آپ ایک مکان کو تلاش کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔"

"کس کا مکان؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

"یہ ایک خوبصورت لڑکی کا مکان ہے۔ گورا رنگ ہے اُس کا، سڈول بدن، بال کٹے ہوئے، مانگ الٹی۔ آنکھوں پر گلابی رنگ کی عینک جس سے اُس کے چہرے کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے۔ چلتی ہے تو سینٹ کی خوشبو ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"

"نینا کو تلاش کر رہے ہو؟" لڑکے نے پوچھا۔

"جی" میں نے کہا۔

"آیئے میرے ساتھ۔"

وہ نوجوان خضر بن کر ہمیں نینا کے گھر چھوڑ آئے۔ ہیرو مجھ سے پوچھنے لگا "آپ نے کیسے جانا کہ ان لڑکوں کو نینا کے گھر کا پتا ہوگا۔"

میں نے کہا "اگر ان لڑکوں کو نہیں پتا ہوگا تو کس کو پتا ہوگا۔"

نینا کے گھر پہنچے تو میں نے فخریہ انداز میں اُس کے والد سے کہا "صاحب داد دیجیے کہ ہم بغیر پتے کے آپ کے گھر پہنچ گئے ہیں۔" بزرگوار کہنے لگے "دلیپ سنگھ جی دل میں اگر لگن ہو تو بھگوان خود رہنما بن جاتے ہیں۔"

مجھے اُس دن پتا چلا کہ بھگوان کا ایک روپ یہ بھی ہے جوان لڑکوں کا تھا۔

بھگوان کے نام سے مجھے یاد آیا جب سے میری عمر پچاس کے ادھر ہوگئی ہے مجھے بھگوان بہت یاد آنے لگے ہیں شاید اس لیے کہ ایک دن انہی کے قدموں میں جاکر ڈیرا جمانا ہے۔ اِس سفر کی میں نے تیاری بھی شروع کر دی ہے۔ اکثر مندر، گوردوارے، مسجد اور چرچ جانے لگا ہوں۔ ان مقدس مقامات پر یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ اللہ

خدا، بھگوان، رام اور رحیم ایک ہی ہستی کے نام ہیں۔ لیکن جب یہ سنا کہ اُس ہستی تک پہنچنے کے راستے الگ الگ ہیں تو میں چکرا گیا۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ بھگوان تک پہنچنے کے جو اتنے سارے راستے بنائے گئے ہیں صرف مجھے چکرانے کے لیے بنائے گئے ہیں کہ میں ڈھونڈتا رہوں اور منزل تک کبھی نہ پہنچ سکوں ورنہ ایک سیدھا راستہ بھی تو بنایا جا سکتا تھا۔

خالی جگہ کو پُر کرو

کچھ روز پہلے جب میں نے اخباروں میں چرنجی لال کی موت کی خبر پڑھی تو مجھے بیحد دُکھ ہوا۔ ویسے چرنجی لال کی موت کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جس سے کسی کو دُکھ ہو۔ مرتے وقت وہ پنچانوے سال کا تھا اور میرا خیال ہے۔ پنچانوے سال خاصی عمر ہوتی ہے۔ بہر حال موت تو آنی ہی تھی۔ کوئی آبِ حیات تو پی نہیں رکھا تھا اس نے۔ پھر چرنجی لال نے اپنی زندگی میں بہتیرے تماشے دیکھے اور کیے تھے۔ جب گاندھی جی نے آندولن چلایا کہ ہندستانی بدیشی کپڑا نہیں پہنیں گے تو چرنجی لال نے بھی اپنا پندرہ سال پرانا کوٹ (جو اُسے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا) نذرِ آتش کر دیا تھا۔

اُسے ۱۹۴۲ء کے آندولن میں ایک لاٹھی بھی لگی تھی جس کی وجہ سے اس کی چھاتی پر زخم کا ایک نشان بن گیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ پُرانا جلایا ہوا کوٹ اور چھاتی پر بنا ہوا لاٹھی کا نشان اس کی روزی روٹی کا سہارا بن گیا۔ وہ نشان دِکھا دِکھا کر اُس نے ایک دُکان، ایک کوٹھی اور کئی بار اسکوٹر اور کاریں الاٹ کروائیں۔ جس پولیس کے سپاہی نے اُسے لاٹھی ماری تھی، اُس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ چرنجی لال کو لاٹھی نہیں مار رہا، اس کی چھاتی پر ایک ایسا تمغا ٹانک رہا ہے جو چرنجی لال کو مالا مال کر دے گا اگر اسے یہ پتہ ہوتا تو وہی لاٹھی وہ اپنے سر پر نہ مار لیتا۔

چرنجی لال کو بھگوان نے پانچ بیٹوں سے نوازا۔ ان بیٹوں نے اپنی زندگی میں خوب ترقی کی جس میں ان کی قابلیت سے زیادہ چرنجی لال کی چھاتی پر لگے ہوئے لاٹھی کے نشان کا دخل تھا۔ بچوں کو شاید اِس بات کا احساس تھا۔ اس لیے وہ اپنے والد کی بیحد عزت کرتے تھے سب نے اپنی اپنی بیویوں کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ صبح اٹھ کر

سنتری جی کے پاؤں چھوا کریں۔ سال میں ایک آدھ بار وہ خود بھی یہ حرکت کر گزرتے تھے۔

چرنجی لال کو ریڈیو والے اکثر دعوت دیتے تھے کہ وہ بھارت کے بچوں اور نوجوانوں کو ۱۹۴۲ء کے آندولن کا حال بتائیں۔ انھیں بتائیں کہ گاندھی جی کے چرنوں میں بیٹھ کر اس نے کیا سیکھا۔ اور بتائیں کہ بھارت کی آزادی کے لیے اس نے کیا کیا قربانیاں دیں۔

چرنجی لال اگر آزادی کے پندرہ بیس سال بعد مر گیا ہوتا تو اس کی موت پر ہزاروں جلسے ہوتے۔ بڑے بڑے لیڈر اسے شردھانجلیاں دیتے۔ سرکار اس کے لڑکوں کو مزید کوٹھیاں الاٹ کرتی۔ کیوں کہ بقول شاعر ع وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا لیکن چرنجی لال سے ایک بھاری غلطی ہو گئی۔ اسے مناسب وقت پر موت نہیں آئی وہ جیتا ہی چلا گیا۔

یہ درست ہے کہ موت پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی سے نہ کوئی جیتا ہے اور نہ کوئی مرتا ہے لیکن فرق اس سے بہت پڑتا ہے۔ چرنجی لال اگر آزادی کے دس سال بعد مر جاتا تو اس کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ لوگ احسان مند ہوتے کہ اس نے دیش واسیوں کو انگریزوں سے آزادی دلوائی۔ لیکن آزادی کے دس سال بعد لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ آزادی کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی۔ خواہ مخواہ ہی لے لی۔ اگلے دس سالوں میں انھیں احساس ہوا کہ جو لوٹ انگریزوں نے مچا رکھی تھی، وہ تو اپنے حکمرانوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ انھیں نکال کر تو ہم گھاٹے میں رہے۔

لوگوں کا بس چلتا تو وہ بہلا پھسلا کر انگریزوں کو واپس لے آتے۔ لیکن ایسا چوں کہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہندستان چھوڑ کر انگریزوں کے دیش میں جا بسے۔ یہ خواہش کچھ اتنی شدت پکڑ گئی کہ انگلینڈ کا ویزا بیس بیس ہزار میں بکنے لگا۔ اپنے آزاد دیش سے بھاگنے کے جذبے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جو انگلینڈ نہ جا سکے وہ سری لنکا میں جا بسنے کو تیار ہو گئے۔

چرنجی لال اب بھی ریڈیو ملکہ ٹی۔ وی سے جنگِ آزادی کی کہانیاں سناتا تھا لیکن سننے والے پتا نہیں کہاں گم ہو گئے۔ لوگ چرنجی لال کی تقریر کو بے وقت کی راگنی کہنے لگے۔ گاندھی جی کو تو لوگ بھلا نہ سکے کہ ان پر ایک سمجھدار انگریز پروڈیوسر

نے ایک بہت اچھی فلم بنادی تھی اور فلمیں تو آپ جانتے ہیں ہمارے نوجوان بہت دیکھتے ہیں اور ان سے اثر لیتے ہیں لیکن اس چکر میں بیچارہ چرنجی لال مارا گیا۔
چرنجی لال جب کہتا کہ میں چرنجی لال ہوں تو لوگ پوچھتے "کون چرنجی لال؟" جب وہ کہتا کہ "جنگ آزادی کا سپاہی" تو لوگ پوچھتے "کون سی جنگ آزادی؟" جب وہ کہتا کہ وہ آزادی جو ہم لے کر آئے تھے تو لوگ پوچھتے کہ اگر لیکر آئے تھے تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟
چرنجی لال کی اولاد نے جب دیکھا کہ یہ سکہ اب چل نہیں رہا تو وہ اپنی جیب میں اس کا بوجھ محسوس کرنے لگے۔ گھر کی بہوؤں کو ایک دن احساس ہوا کہ گو سسر جی کے پانو چھونے سے وہ سورگ میں تو جاسکیں گی لیکن یہ بھی تو خطرہ ہے کہ اتنے غلیظ پانو چھونے سے انھیں کوئی بیماری لگ جائے اور وہ قبل از وقت ہی سورگ لوک میں پہنچ جائیں یہ تشویش جب انھوں نے اپنے خاوندوں پر ظاہر کی تو انھوں نے فکرمند ہوکر یہ راستہ نکالا کہ پتاجی کی عزت تو دل میں ہونی چاہیے پانو چھونا تو پرانے یگ کی ایک روایت ہے جس کا آج کے یگ میں کوئی مقام نہیں۔
کوٹھی جو چرنجی لال نے بنوائی تھی اس کے باہر تو اسی کا نام لکھا رہا لیکن کوٹھی کے اندر آہستہ آہستہ اس کا نام ونشان مٹتا چلا گیا۔ پہلے ڈرائنگ روم میں نہ صرف چرنجی لال خود بیٹھا دکھائی دیتا تھا بلکہ اس کی ایک بڑی سی تصویر بھی آویزاں رہتی تھی آہستہ آہستہ اُس کا اپنا اور اُس کی تصویر کا وجود کوٹھی کے بہتر کمروں سے ہٹتا چلا گیا۔ آخر میں تصویر کا تو پتہ نہیں کیا بنا، لیکن خود چرنجی لال کا بستر کوٹھی کے ایک مختصر سے اسٹور میں پہنچ گیا۔ اُس نے جب اپنے بڑے بیٹے سے شکایت کی کہ اُس کمرے میں تو وہ اپنے پانو بھی اچھی طرح نہیں پھیلا سکتا تو فرمانبردار بیٹے نے جواب دیا کہ "پتاجی! آپ نے خود ہی ہمیں سکھایا ہے کہ انسان کو ہمیشہ چادر دیکھ کر پانو پھیلانے چاہئیں"۔
چرنجی لال نے جب دیکھا کہ پانو پھیلانے کے لیے گھر میں جگہ کم ہوگئی ہے تو اُس کا زیادہ وقت گھر کے پاس ایک پارک کے بنچ پر گزرنے لگا۔ شروع شروع میں کئی لوگ اس کے پاس آ بیٹھتے تھے۔ چرنجی لال کی مشکل یہ تھی کہ وہ چپ نہیں بیٹھ سکتا تھا جہاں چار آدمی دیکھتا، بھاشن شروع کر دیتا۔

ایک دن بھاشن کے جوش میں اقبال کے اس شعر کی تشریح کر رہا تھا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

تقریر کے جوش میں کہنے لگا کہ ۱۹۴۷ء میں ہم ہندستانی یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ایک ہی گلاس سے پانی پیتے تھے اور ایک ہی تھالی سے کھاتے تھے۔ اس کے سننے والے چوں کہ اخبار پڑھتے تھے اس لیے انھیں لگا کہ چرنجی لال یا تو کسی اور ملک کی بات کر رہا ہے یا پھر اس کا دماغ سٹھیا گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس سے کھسک گئے، اور پھر کبھی نزدیک نہ پھٹکے۔ اب چرنجی لال تھا اور پارک کی بیچ کا ایک کونہ۔ دور دور تک سامعین کا نام و نشان نہ تھا۔

انسان بھی ایک عجیب طرح کی مشین ہے۔ بات کرنا اس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا روٹی کھانا۔ چرنجی لال کے پاس بات کرنے کو کچھ نہ رہا تو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ ویسے تو خود سے باتیں کرنے میں کوئی برائی نہیں لیکن مشکل اس میں یہ ہے کہ بولنے والا تو تھکتا نہیں لیکن سننے والا بہت جلد بور ہو جاتا ہے۔ چرنجی لال آہستہ آہستہ اپنے بھاشن سے بور ہونے لگا۔ سننے والے چرنجی لال نے ایک دن بولنے والے چرنجی لال کو ڈانٹ دیا کہ یار اب بند کر۔ میں تنگ آ گیا ہوں تیری بکواس سنتے سنتے۔ بولنے پر پابندی لگ گئی تو چرنجی لال بیمار رہنے لگا۔

اچھے بھلے کو جب کوئی گھر میں رکھنے کو تیار نہیں تھا تو بیمار کو کون رکھتا۔ چرنجی لال کے بیٹے اُسے اسپتال بھرتی کرا آئے۔ ڈاکٹر کے اِس بیان سے انھیں بہت تسلّی ہوئی کہ ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بس پڑا رہے گا، جب تک اس کا آخری وقت نہیں آتا۔ گویا چرنجی لال سے رشتہ چھوڑے بغیر ان کی جان چھوٹ گئی۔

چرنجی لال کئی مہینے ہسپتال کے جنرل وارڈ کے ایک کونے میں پڑا رہا۔ اُسے بستر پر اس لیے نہیں رکھا گیا کہ ایسے مریض کو عام طور پر بستر نہیں ملتا جس کی زندگی کے پروگرام کے بارے میں ہسپتال والے بے خبر ہوں۔ وہ تو ایسے مریض میں دلچسپی لیتے ہیں جو کچھ دنوں بعد یا تو اپنے گھر چلا جائے یا بھگوان کے گھر۔ ہسپتال تو ایک

طرح کی سرائے ہے۔ مستقل سکونت کا اس میں کوئی انتظام نہیں۔
پتہ نہیں چرنجی لال نے اپنے مرنے کی دعا مانگی یا ویسے ہی بھگوان کو رحم آگیا۔ وہ ایک دن اچانک اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کی موت نے ایک طرح سے اُسے زندہ کر دیا۔ ایک دم رشتہ داروں کو، یار دوستوں کو اور سب سے زیادہ دیش کے نیتاؤں کو خیال آیا کہ چرنجی لال بھی کوئی تھا۔ اس کی موت کی خبر اخبارات میں اُس کی تصویر کے ساتھ شائع ہوئی۔ اور یہی خبر تھی جسے پڑھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔
کئی لیڈروں کے بیان تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔ "چرنجی لال کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی بھرا نہ جا سکے"۔
مجھے دکھ اس لیے ہوا کہ اس خلا کو بھرنا کیوں مشکل ہے۔ ایک کوٹھی کے ایک چھوٹے سے اسٹور کو، پارک کے ایک حصّے کو، ہسپتال کے جنرل وارڈ کے ایک کونے کو بھرنا کیوں اتنا مشکل ہو گیا ہے۔ کیا ہمارے یہاں ایسے لوگ بالکل ہی معدوم ہو گئے ہیں جو اس خلا کو بھر سکتے ہیں؟

دوسری زنجیر

میرے بارے میں اکثر لوگوں کو شکایت ہے کہ میں ہمیشہ اپنے قد سے اونچی بات کرتا ہوں۔ ذاتی طور پر میں اپنی اس عادت کو بہت خراب نہیں سمجھتا۔ پہلی بات تو یہ کہ ایک آدمی جس کا قد ہی پانچ فٹ تین انچ ہے وہ زیادہ سے زیادہ کتنی اونچی بات کرے گا۔ اور دوسری یہ کہ آج کل چھوٹی بات کرنے والے کو پوچھتا کون ہے؟

اور پھر ہمارے ہاں تو اونچی بات کرنے کی باقاعدہ روایت ہے۔ ہمارا تو وطیرہ رہا ہے کہ اگر گھوڑے پر چڑھنا ہی ہے تو ہوا کے گھوڑے پر چڑھو کہ اُس سے زیادہ تیز رفتار کوئی ہو نہیں سکتا۔ اقبال جیسا معتبر شاعر جس نے دنیا دیکھی ہوئی تھی جب ہندستان کی تعریف میں نغمہ سرا ہوا تو اُس کے قلم سے سیدھی یہ بات نکلی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا

حالانکہ سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور امریکہ کی حالت تب بھی کچھ اتنی خراب نہیں تھی۔ ہمارے ایک اور شاعر جناب داغ دہلوی نے اردو زبان کے بارے میں کہہ دیا کہ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

حالانکہ یہ دھوم خود ہندستان کے کئی صوبوں میں ہمیں دکھائی نہیں دی۔

اُن کو تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس مجھ غریب کو دھر لیتے ہیں۔

اِس سلسلے میں ایک اور عرض کرنا چاہوں گا۔ میں اگر اپنا عہدہ یا اپنی تنخواہ بڑھا کر بتاتا ہوں یا کچھ بارسوخ لوگوں سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔

تو اس میں کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ میں جب اپنی تنخواہ بڑھا کر بات کرتا ہوں تو نہ تو مجھے ملازم رکھنے والوں کے خزانے میں کچھ کمی آتی ہے اور نہ ہی میرے ہاں ہُن برسنا شروع ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ہمارے ایک دوست جب کبھی مہنگائی کا رونا روتے تھے تو ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ دیکھو یار، بادام کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔ پستہ کتنا اونچا چلا گیا ہے۔ کاجو کتنا تیز ہو گیا ہے۔" ایک بار میں نے کہا "بھائی تم اُن چیزوں کی بات کرو جو تم کھاتے ہو۔ بادام تم نے تب بھی نہ کھائے جب سستے تھے۔" کہنے لگے "ٹھیک ہے، لیکن مہنگائی کا ذکر میرے گھر کی دال روٹی کے ساتھ کچھ مزا نہیں دیتا۔"

میری اس عادت کی وجہ سے آج تک کبھی کسی دوسرے کا نقصان نہیں ہوا۔ لیکن خود میں کئی ایسے تجربات سے گزرا ہوں جنہیں آج تک بھول نہیں پایا۔ آیئے آپ کو بھی ایک ایسے واقعے سے روشناس کراؤں۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں سیلزمین کی نوکری کے لیے تگ و دو کر رہا تھا۔ ایک جگہ بلایا گیا تو میں نے بناوٹی رشتے داروں کے جعلی خطوں کی مدد سے معاملہ پہلے سے فٹ کر لیا۔ کمپنی کا مالک میرے "رشتہ داروں" سے اتنا مرعوب ہوا کہ تنخواہ بھی معقول طے کر دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ کام بھی کچھ مرنے مارنے کا نہیں ہے۔ کہنے لگا "ہم لوگ مکھیاں بناتے ہیں۔ اِن مکھیوں کے متعلق ہم نے اشتہارات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اِس سے بہتر مکھی آج تک بنی نہیں۔ اُس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ میں اپنے گھر میں یہ مکھی کبھی استعمال نہیں کرتا۔" پھر اپنے ہی لطیفے پر کھل کر ہنسنے کے بعد اُس نے کہا۔ دُکان پر گاہک خود بخود چلے آتے ہیں اور قیمت چکا کر مکھی لے جاتے ہیں۔ آپ کا کام بس اتنا ہو گا کہ قیمت وصول کر کے نوٹ گلّے میں رکھ دینا اور اگلے دن بینک میں جمع کروا دینا۔

اُس کی بات سن کر شاید میرے اندر سوئے ہوئے شیخ چلّی کی نیند میں خلل آ گیا اور میری زبان سے نکلا۔

"بس؟"

مینجر نے کہا "دیکھیے صاحب لالہ لاجپت جی کے پوتے سے ہم کیا زیادہ کام لیں گے؟"

چونکہ میرے اندر کا شیخ چلی بیدار ہو چکا تھا، اُسے سُلانا مشکل ہو گیا۔ میں نے کہا "اگر کام اتنا آسان ہے تو آپ کسی اور کو رکھ لیجیے۔ آسان کام نہ کبھی میں نے کیا ہے اور نہ کروں گا۔"

منیجر نے کہا "لیکن لالہ لاجپت رائے کے پوتے کو۔۔۔۔"

"وہ ٹھیک ہے لیکن محنت کے بغیر کمائی ہوئی روٹی میرے حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ مجھے کوئی مشکل کام بتائیے ورنہ مجھے آپ کی نوکری نہیں چاہیے۔"

منیجر میرے دیے ہوئے جعلی خط بھی پڑھ رہا تھا اور میری شکل بھی دیکھ رہا تھا۔ اور دونوں میں کوئی مطابقت نہیں پا رہا تھا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر یہ بات ہے تو صاحب آپ یوں کیجیے کہ میری مکسی دیہات میں جا کر بیچیے۔ دیہات کے لوگ ابھی تک مکسیوں سے واقف نہیں ہیں۔ اُن کا اِن سے تعارف کروائیے۔"

میرے مُنہ سے نکلا: "یہ ہوئی نا بات۔"

منیجر کے دفتر سے نکل کر میں نے اپنے اندر کے شیخ چلی کو بہت ڈانٹا۔ میں نے کہا "گدھے اچھی بھلی دکان پر بیٹھنے کی نوکری مل رہی تھی۔ اب گانو گانو گھومو گے تو کیا اچھا لگے گا۔" لیکن اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید پھر سے سو گیا۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ مکسی کو ایک جھولے میں ڈالا اور اگلے دن ایک گانو کو چل دیا۔

گانو کی شکل دیکھی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ لوگ مکسی تو کیا سِل بٹّہ خریدنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔

ملک کی آزادی کے بارے میں ایک چیز جو مجھے بہت پسند ہے وہ یہ کہ ہم نے انگریز کے جانے کے بعد کسی چیز میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ کبھی انگریز اگر واپس آ گیا تو کم از کم اِس بات کی شکایت نہیں کر سکتا کہ ہم نے اُس کی غیر موجودگی میں سب کچھ اُلٹ پلٹ کر دیا ہے۔

تھوڑی اور چھان بین کی تو پتا چلا کہ گانو میں ایک ایسا آدمی ہے جو اگر چاہے

تو کچھ بھی خرید سکتا ہے۔ میں جب اُس کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے سامنے ایک کھلے صحن میں روٹی کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے پوچھا:

"کیا چاہیے؟"

"آپ کھانا کھا لیجیے آپ سے بات کرنی ہے۔"

"بات اگر تمھیں کرنی ہے تو کرتے جاؤ۔ مجھے تو صرف سننا ہے، میں کھانا کھاتے ہوئے بھی سن سکتا ہوں۔"

میں سمجھ گیا آدمی چالو ہے۔ لیکن میرے اندر سے شیخ چلی کی آواز آئی، "تو بھی چالو ہو جا۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب، میں شہر سے آیا ہوں۔ اور صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ ہمیں اپنے گاؤں میں رہنے والے بھائیوں کی کتنی فکر ہے۔ ہم نے جب بجلی ایجاد کی تو یہ نہیں کیا کہ بجلی کے سارے فائدے خود ہی اُٹھالیں۔ ہم نے اسے گاؤں گاؤں پہنچایا۔"

چوہدری نے پانی کی مدد سے نوالہ نگلتے ہوئے کہا "یہ بجلی تو نے بھجوائی ہے؟ بہت مہربانی بھائی۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب بجلی میں کیا بھجواؤں گا؟ میں تو صرف یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مت سوچیے کہ ہم شہریوں کو گاؤں کی فکر ہی نہیں ہے۔ ہم تو جو چیز بھی بناتے ہیں اُسے گاؤں میں پہنچوانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔"

چوہدری نے جیسے میری بات اَن سُنی کر دی اور زور سے آواز لگائی، "رامو تھوڑی سی چٹنی اور لاؤ۔"

مجھے شیخ چلی نے اندر سے ٹھوکا دیا۔ "شروع ہو جا بیٹا۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب میں دیکھ رہا ہوں کہ چٹنی آپ کو بہت پسند ہے۔"

"ہاں بھئی اگر اچھی بنی ہو تو مجھے بہت پسند ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چٹنی میں پیاز ہو، پودینہ ہو، ہری مرچ ہو، انار دانہ ہو، نمک ہو۔ لیکن یہ سب اس طرح سے گڈمڈ ہو جائیں کہ پتا نہ چلے کون کہاں ہے۔"

"واہ !" میں نے کہا "چٹنی کے بارے میں آپ کے وچار کتنے اونچے ہیں"۔
چوہدری خوشامد سے پگھل گیا اور کہنے لگا "بھیّا میرے تو یہی وچار ہیں چٹنی کے بارے میں۔ اب اونچے ہیں یا نیچے یہ تم جانو"۔

رامو چٹنی دے کر گیا تو میں نے کہا "چوہدری صاحب چٹنی کا جو خوبصورت نقشا آپ کے ذہن میں ہے اُسے پورا کرنے کا جو سادھن ہے بدقسمتی سے وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ آج میں وہی آپ کی خدمت میں پیش کرنے لایا ہوں"۔ تھیلے میں سے مکسی نکال کر میں نے کہا "چٹنی کے بارے میں جو تصور آپ کے ذہن میں ہے۔ اسے حقیقت کا روپ دینے کا یہ آلہ ہے اور اسے کہتے ہیں مکسی"۔ اب میرے پورے وجود پر شیخ چلی کا قبضہ تھا اور میں کہہ رہا تھا۔ "یہ مکسی خریدنے کے لیے شہر میں ہماری دکان کے سامنے لوگوں کی لائن لگی رہتی ہے۔ لیکن میں چالاکی سے دکان کے پچھلے دروازے سے ایک مشین نکال کر آپ کے پاس چلا آیا۔ خیال دل میں یہ تھا کہ میرے بزرگ، میرے مہربان جو گاؤں میں خون پسینہ بہا کر ہمارے لیے اناج پیدا کرتے ہیں، اس مشین پر اُن کا حق ہم سے زیادہ ہے۔ چنانچہ یہ مشین میں ایک ہزار روپے کی حقیر رقم کے بدلے میں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں"۔

چوہدری نے نوالہ روک کر پوچھا۔
"یہ مشین کیا آپ لوگوں نے اب بنائی ہے؟"
"جی ہاں" میں نے کہا۔
"کمال ہے" چوہدری بولا "میرے پردادا نے تو ایسی مشین برسوں پہلے بنائی تھی"۔

مجھے یوں لگا جیسے چوہدری کے حلق کا نوالہ میرے حلق میں آکر اٹک گیا ہے۔ میں نے کہا "آپ کے پردادا نے؟"
"جی ہاں۔"
"آپ کے پردادا اتنے بڑے سائنس داں تھے اور ہم لوگ اُن کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں"۔
"وہ گپت کام کرنا پسند کرتے تھے۔ شہرت اُن کی کمزوری نہیں تھی"۔

مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میں اپنے اصل مضمون سے ہٹ رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے کہا: "لیکن آپ کے پر دادا کی بنائی ہوئی مشین تو اب تک خراب ہو چکی ہوگی۔"

"نہیں نہیں۔ وہ تو ابھی بھی کام کر رہی ہے۔ اصل میں میرے پر دادا کچھ ایسا سلسلہ کر گئے ہیں کہ جب مشین خراب ہونے لگتی ہے تو ایک نئی مشین کو جنم دے دیتی ہے۔ اس وقت میرے پاس اس مشین کا تیسرا اڈیشن ہے۔ اسی لیے میں آپ کی مشین نہیں خرید سکتا۔"

مجھے محسوس ہونے لگا کہ یا تو چوہدری کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا پھر یہ مجھے اُلّو بنا رہا ہے۔ میں نے کہا "آپ بے شک میری مشین نہ خریدیے، لیکن اپنی مشین کے درشن تو کروا دیجیے۔"

"ضرور ضرور" چوہدری نے کہا اور پھر رامو کو آواز دی۔ رامو جب سامنے آیا تو چوہدری بولا۔ "یہ ہے میری مشین۔"

"آپ ایک پردیسی سے مذاق کر رہے ہیں چوہدری صاحب۔ یہ تو آپ کا نوکر رامو ہے۔"

"نہیں جناب یہی میری مشین ہے۔ یہ چٹنی اتنی باریک پیستا ہے کہ آپ کی مشین دنگ رہ جائے گی۔"

"بات میرے پلے نہیں پڑی چوہدری صاحب"

"بڑی سیدھی سی بات ہے بھیا۔ رامو کے پر دادا نے میرے پر دادا سے دس روپے قرض لیے تھے۔ قرض ادا نہ کر سکا تو وہ میرے پر دادا کا بندھوا مزدور ہو گیا۔ اس کا پر دادا محنت سے کام کرتا گیا لیکن قرض زیادہ تیزی سے بڑھتا گیا۔ اس کے بعد اس کا باپ اور پھر یہ ہمارے ہاں مزدوری کر رہا ہے۔ چٹنی اتنی باریک پیستا ہے کہ پوچھو مت۔ تمھاری مشین سے بھی باریک۔ بات اب پلے پڑی بھائی؟"

ایک دم میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ مجھے لگا کہ جوں ہی میں اپنے خیال کو الفاظ کا جامہ پہناؤں گا، چوہدری چاروں شانے چت ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے فاتحانہ انداز میں کہا:

"حضور سرکار نے تمام بندھوا مزدور آزاد کر دیے ہیں۔ رامو بھی آزاد ہے۔ رامو

کو شاید ابھی تک پتا نہیں۔ جس دن پتا چل گیا یہ آپ کے چنگل سے نکل جائے گا۔"

"رامو کو پتا ہے۔ لیکن رامو شہریوں کی طرح بے شرم نہیں ہے۔ اُسے پتا ہے کہ اگر قرض ادا کیے بغیر وہ اس دنیا سے چلا گیا تو بھگوان سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا۔ میں تو اُسے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ جا چلا جا لیکن وہ خود ہی نہیں جانا چاہتا کہ اس طرح بھگوان کی نظروں میں جھوٹا پڑ جائے گا۔" اور پھر چوہدری نے رامو کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیوں رامو جانا چاہو گے؟"

میں نے رامو کی طرف دیکھا۔ رامو خاموش تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اُس کی ایک بیڑی تو کٹ گئی ہو لیکن کسی دوسری نے اُسے جکڑ رکھا ہے جس کا کٹنا شاید ناممکن ہے۔

جاہل کہیں کا

حالانکہ اِس کہانی کے کردار فرضی نہیں ہیں، پھر بھی اُن کا نام اور پتا میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ نام اور پتا تو ایک طرف، میں اُن کا صحیح حلیہ بتانے سے بھی گریز کروں گا کیونکہ ان کے حُلیے میں آپ کو ایک آدھ نقش و نگار بھی اپنا نظر آگیا اور آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ خواہ مخواہ میری جان کے درپے ہو جائیں گے۔ ویسے بھی اِن دنوں سوسائٹی میں کچھ ایسی اتھل پتھل ہو رہی ہے کہ کئی گیدڑ شیر کی کھال پہنے دہاڑ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اِن میں کئی ایک ایسے بھی ہوں جنھوں نے شیروں ایسے دانت بھی لگوا لیے ہوں اور انھیں مردم خوری کا چسکا پڑ گیا ہو۔ ایسے شیروں کو حلیہ بتا کر میں تو مارا جاؤں گا نا۔

ویسے میں اُن ادیبوں میں سے نہیں ہوں جو سچ کہنے سے خوف کھاتے ہیں۔ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں۔ اکثر مجھے سچ بولنے پر انعام بھی ملا ہے۔ بلکہ اب تو میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ انعام کی رقم ذہن میں رکھ کر ہی فیصلہ کرتا ہوں کہ سچ کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔

کہانی میری اُن دِنوں کی ہے جب ہندستان کی ریاستوں میں راجے مہاراجے راج کرتے تھے۔ راج کے پردے میں جو کچھ وہ کرتے تھے، اس سے مجھے غرض نہیں۔ لیکن کسی اور مناسب لفظ کی عدم موجودگی میں مجھے راج کرنا ہی کہنا پڑے گا۔

ایسے ہی ایک مہاراجہ کا راج کمار شکار کے لیے گھر سے نکلا۔ یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ راج کمار شکار کے لیے گھر سے کیوں نکلتے تھے۔ شکار تو اُن کے گھر خود بخود پہنچ جاتا تھا۔ شاید یہ وجہ ہو گی کہ راج کمار یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کھانے پینے کا بندوبست اپنے زورِ بازو سے کر رہے تھے۔

راج کمار شکار کی تلاش میں جارہا تھا کہ اُسے شدت سے پیاس کا احساس ہوا۔ ویسے تو راج کمار اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ بندوقیں تلواریں اور دنیا بھر کا کھانے کا سامان لے کر نکلا تھا لیکن پتا نہیں پانی کا انتظام کرنا کیوں بھول گیا۔ خیر اس کی کوتاہی پر مجھے خوشی ہے کیونکہ اگر اس کے پاس پانی کی چھاگل ہوتی تو میری کہانی آگے نہ بڑھ سکتی۔

پیاس کا احساس ہوتے ہی راج کمار کو کسی تالاب کی تلاش ہوئی۔ تالاب نظر آیا تو اُس پر گاؤں کی لڑکیوں کا ایک جھرمٹ دکھائی دیا۔ گاؤں کی لڑکیاں اپنے اپنے گھڑے لے کر تالاب پر پانی بھرنے آئی ہوئی تھیں۔ آپ نے کسی نہ کسی تالاب پر یہ سین ضرور دیکھا ہوگا۔ بہت رومانٹک ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہمارے دیہات میں پانی بھرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ اگر نل گھروں میں لگ گئے تو شاید لوگوں کو آرام تو ہو جائے لیکن دیہات کی زندگی میں رومانس ناپید ہو جائے گا۔ جس کی ضرورت ہمیں پانی سے کہیں زیادہ ہے۔

لڑکیوں کے اِس جھرمٹ میں ایک لڑکی نے راج کمار کو اپنے گھڑے سے پانی پلاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانک لیا۔ یہ اس کی بڑی بھاری غلطی تھی۔ راج کمار کی پیاس تو بجھ گئی لیکن اب ایک عجیب طرح کی بھوک اس پر غالب آگئی جو پھلوں اور میووں سے نہیں مٹتی۔

راج کمار کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ لڑکی کو اُٹھا کر محل میں لے چلیں۔ لیکن لڑکی شاید کسی اور مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اُسے محل میں جانے سے تو انکار نہیں تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ راج کمار باقاعدہ بارات لے کر آئے اور اٹھا کر لے جانے کے بجائے اُسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے۔ راج کمار کے مشیروں نے بہت سمجھایا کہ بارات اگر آئے گی تو لڑکی کے باپ کو بہت خرچ کرنا ہوگا۔ کیونکہ بارات کی خدمت کے علاوہ جہیز بھی دینا ہوگا۔ اس کا گھوڑے پر بیٹھ کر جانا سستا رہے گا، لیکن لڑکی نہیں مانی۔

محل میں واپس جا کر راج کمار نے سارا ماجرا اپنے والد بزرگوار یعنی مہاراجہ صاحب کو جا سنایا۔ انہیں اپنے فرضِ منصبی سے فرصت کہاں تھی کہ بیٹے کی بارات میں جاتے کہنے لگے مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔ میں ایک بار اپنی بارات لے کر گیا تھا، اس میں ہی تین چار دن ضائع ہو گئے تھے۔ اُس کے بعد جب بھی مجھے ایک اور رانی کی ضرورت محسوس ہوئی ہیں

نے سپہ سالار کو بھیج کر منگوالی۔ تمھاری بارات یں یں چلا بھی جاتا اگر بارات کسی اور ریاست
یں جا رہی ہوتی۔ لیکن ایک معمولی سے زمیندار کے گھر بارات لے کر جانا ہمیں شوبھا نہیں
دیتا۔

مسئلہ خاصا اُلجھ گیا۔ راج کمار بضد کہ اُسی لڑکی سے شادی کرے گا۔ مہاراجہ بضد
کہ بارات لے کر جائے گا نہیں اور لڑکی بضد کہ وہ ڈولی یں بیٹھے بغیر محل یں آئے گی نہیں
لیکن اوپر والا بڑا کارساز ہے۔ اچانک ایک دن مسئلے کا حل پیدا ہو گیا۔ مہاراجہ ایک دن
اچانک گھوڑے سے گر کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا مِلا۔ راج کمار مہاراجہ بن گیا اور وہ
گانو کے تالاب پر راج کمار کو پانی پلانے والی لڑکی باقاعدہ ڈولی یں بیٹھ کر محل
یں آگئی۔

عام طور پر کہانی یہاں ختم ہو جانی چاہیئے لیکن میری کہانی تو دراصل یہاں سے
شروع ہوتی ہے۔ لڑکی جب رانی بن گئی تو وہ بھولا بھالا کسان جس کی وہ بیٹی تھی خود کو
تیس مار خاں سمجھنے لگا۔ زیادہ پریشانی رویا (یہ اس لڑکی کا نام تھا) کے بھائی وِکرم سنگھ
نے پیدا کی، جواب مہاراج کا سالا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ مہاراج کا سالا ہونا بجائے
خود ایک ممتاز پوزیشن سہی لیکن یہ کوئی عہدہ نہیں ہے۔ ہمیں باقاعدہ ایک عہدہ چاہیئے۔
ویسے تو وِکرم سنگھ قابل آدمی تھا۔ دنیا کی اونچ نیچ اور اتار چڑھاو سے واقف
تھا لیکن تعلیم بالکل نہیں تھی۔ مہاراج کے لیے مشکل یہ تھی کہ ایک اَن پڑھ آدمی کو کس
رتبے پر تعینات کیا جائے۔ پارلیمنٹ اُن دنوں تھی نہیں ورنہ ایسے کئی اَن پڑھ وہاں
کھپائے جا سکتے تھے۔

مہاراج پر سالے صاحب کا دباو جب بڑھنے لگا تو انھوں نے وعدہ کر لیا کہ جونہی
کوئی مناسب ویکنسی نکلتی ہے وہ اُسے اُس پر تعینات کر دیں گے۔ سالے صاحب
نے خود بھی نکلنے والی ویکنسیوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ ایک دن انھیں معلوم ہوا
کہ ریاست یں ایک مجسٹریٹ کی پوسٹ خالی ہوئی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ مہاراج
کے درپے ہو گئے کہ اس عہدے پر انھیں تعینات کیا جائے۔ مہاراجہ نے سمجھانے کی
بہتیری کوشش کی کہ یہ کام اُن کے بس کا نہیں کیونکہ وہ قانون کی پیچیدگیوں سے واقف
نہیں ہیں لیکن وہ کہنے لگے قانون کی پیچیدگیوں سے مجھے کیا لینا دینا۔ انصاف ہی تو کرنا

ہے، کر دیا کریں گے۔ اگر کوئی بے قصور غلطی سے جیل بھیج بھی دیا گیا تو کونسی مصیبت آجائے گی۔ کئی لوگ جیل کے باہر بھی جیل کی سی زندگی گذار رہے ہیں، کیا فرق پڑے گا۔
لوجی سالے صاحب مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔
جب ہمیں یہ خبر ملی تو ہمیں خواہش ہوئی کہ ایک دن انھیں کچہری میں انصاف کرتے ہوئے دیکھیں۔ پڑھے لکھے مجسٹریٹ تو بہت دیکھے ہیں، ایک اَن پڑھ مجسٹریٹ کے درشن بھی کر لیں۔
خبر ملی کہ مجسٹریٹ صاحب ایک کھلے میدان میں کچہری کریں گے۔ خبر ملتے ہی ہم وہاں پہنچے۔ وہاں سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ اُن کے درمیان وِکرم سنگھ اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔
جب لوگ ذرا بیٹھ گئے تو وِکرم سنگھ جی نے اعلان کیا کہ کیس پیش ہو۔
ایک کسان جس کے تن کا لباس اِس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ حالت اس کی وہی ہے جو ہمارے ہاں عام طور پر کسان کی ہوتی ہے، ہاتھ جوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا تکلیف ہے سالے؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔
جب سے وہ مہاراج کے سالے بنے تھے ہر ایک کو خود کا سالا سمجھتے تھے۔
کسان نے کہا "جناب گانو کے مہاجن نے مجھے لوٹ کھایا ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کی شادی پر اس سے پانچ سو روپے قرض لیے تھے۔ کئی بار یہ روپے واپس کر چکا ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ قرض ابھی ادا نہیں ہوا۔ جناب میں جو کچھ کماتا ہوں۔ اس کی نذر ہو جاتا ہے۔ مائی باپ مجھے اِس کے ظلم سے چھٹکارا دلایئے۔"
مجسٹریٹ وِکرم سنگھ نے موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"وہ سالا مہاجن یہاں موجود ہے کیا؟"
مہاجن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
مجسٹریٹ نے اُس کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔
"سالے کو جیل میں بند کر دو"۔
پولیس کے انسپکٹر نے پوچھا "حضور کتنے دِنوں کے لیے"۔
"دنوں سے کیا مطلب، بس بند کر دو۔ جب نکالنا ہو گا ہم خود تمھیں بتا دیں گے۔"

اتنے میں سفید پتلون، کالے کوٹ اور کالی نکٹائی میں ملبوس ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔
" آپ میری جرح سُنے بغیر کیس کا فیصلہ نہیں کر سکتے "۔
" تو کون ہے سالے "۔
" میں ملزم کا وکیل ہوں جناب "۔
" تُو اب تک کہاں تھا؟ اب تو ہم نے فیصلہ سُنا دیا۔ تُو پہلے کیوں نہیں بولا "۔
" حضور آپ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا "۔
" موقع ؟ یہ کوئی جلسہ نہیں ہو رہا ہے کہ ہم نام پکاریں گے کہ اب فلاں صاحب کا بھاشن ہوگا۔ یہ مجسٹریٹ وِکرم سنگھ کی کچہری ہے۔ خیر اب تو کھڑا ہو ہی گیا ہے تو بول کیا کہنا چاہتا ہے "۔
وکیل نے ایک موٹی سی کتاب اٹھائی۔ اُس کو ایک جگہ سے کھولا، گلا صاف کیا اور کچھ بولنے والا ہی تھا کہ مجسٹریٹ نے ٹوک دیا۔
" وکیل سالے اتنا تو مانتے ہو نا کہ یہ مقدمہ ایک کِسان اور گاؤں کے مہاجن کے درمیان ہے "
" جی حضور "۔
اور یہ بھی مانتے ہو کہ مہاجن نے کسان کو قرض دیا تھا "۔
" جی حضور "
" اور یہ بھی جانتے ہو کہ کسان کی شکایت ہے کہ مہاجن اُس کا خون چُوس رہا ہے "۔
" جی حضور "
" تو سالے تُو کیا یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خون مہاجن نہیں بلکہ کسان چُوس رہا ہے۔ سالے تُو اتنے سال کالج میں کیا یہی بکواس پڑھتا رہا ہے "۔
اِس کے بعد مجسٹریٹ نے اعلان کر دیا کہ اب کچہری برخواست کی جاتی ہے۔ وِکرم سنگھ گھوڑے پر سوار ہو کر محل کو لوٹ گیا۔
مہاجن کو پولیس کا انسپیکٹر جب جیل لے جانے کا بندوبست کر رہا تھا، اس کا وکیل اُس کے پاس آ کھڑا ہوا، اور کہنے لگا۔
" مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں انصاف نہ دلا سکا۔ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مہاراج نے ایک اَن پڑھ کو مجسٹریٹ بنا دیا ہے جو قانون کی پیچیدگیوں کو سمجھتا ہی نہیں۔ جاہل کہیں کا۔

بن مانگے موتی ملیں ....

میں اپنے کمرے میں ایک مضمون لکھنے میں مصروف تھا کہ باہر سے ایک فقیر کی صدا آئی ۔" اللہ کے نام پر کچھ دے دے بابا تیرا بھلا ہو گا ۔" میں نے سوچا ایک بار صدا لگا کر فقیر آگے بڑھ جائے گا، لیکن وہ ڈٹا رہا اور چلّاتا رہا " اللہ کے نام پر کچھ دے دے بابا . . . . "

مجبوراً مجھے باہر آنا پڑا ۔ میں نے دیکھا کہ بھکاری کی صحت مجھ سے کہیں بہتر تھی ۔ میں نے کہا : " بھائی بھیک کیوں مانگتے ہو ۔ کچھ کام دھندا کیوں نہیں کرتے ؟ " کہنے لگا : "غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے کام نہ کرنے سے دنیا کا کوئی کام رُکا ہوا نہیں ہے " میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا کہ میرا وار خالی گیا ۔

اس سے جان چھڑانے کے لیے میرے لیے کوئی نئی ترکیب سوچنا ضروری ہو گیا ۔ میں نے کہا : " بھائی اگر اللہ نے تمھیں پیدا کیا ہے تو روٹی بھی دے گا ۔ یوں ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلانا اچھا لگتا ہے کیا ؟ " کہنے لگا اچھا تو نہیں لگتا لیکن کیا ہے کہ خدا عام طور پر اپنے بندوں کو روزی بھیجنے کے لیے کسی اور کو وسیلہ بنا لیتا ہے ۔ مثال کے طور پر ہزاروں لوگوں کو روزی پہنچانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے سرکاری دفتر کھول دیے ہیں ۔ لوگ وہاں جاتے ہیں ۔ کچھ کریں یا نہ کریں، تنخواہ انھیں مہینے کے مہینے ملتی رہتی ہے ۔ یعنی

رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کا

لیکن اپنے بارے میں مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا کہ میری روزی کا وسیلہ خدا نے کس کو بنایا ہے ۔ چنانچہ میں ہر ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں ۔ وہ شعر ہے نا کہ

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میری بس وہی حالت ہے۔
میں نے جب دیکھا کہ اُسے شاعری کی تمیز ہے تو میں نے ایک حملہ ادھر سے کیا۔
میں نے کہا " تم اس شعر کا مطلب تو سمجھتے ہی ہوگے :

بن مانگے موتی مِلیں
مانگے ملے نہ بھیک

کہنے لگا : معنی تو سمجھتا ہوں لیکن میرا اِس شعر پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میں گھنٹوں کاسۂ گدائی لے کر بیچ بازار کھڑا رہا ہوں لیکن کِسی نے موتی تو کیا ایک کھوٹا سکہ بھی اُس میں نہیں ڈالا۔"
جب میں نے اس کی ہتھیلی پر ایک روپیہ رکھا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے کہنے لگا: " یہ مت سمجھنا کہ بھیک مانگنا کوئی آسان کام ہے۔ سیکڑوں استادیاں کرنی پڑتی ہیں تب کوئی جیب سے پیسے نکالتا ہے۔ خود ہی دیکھ لو۔ تم سے ایک روپیہ نکلوانے کے لیے مجھے کیا کیا کرنا پڑا۔"

اس کی بات سن کر میرے ذہن میں ایسے بے شمار بھکاریوں کی تصویر گھوم گئی جن سے میں زندگی میں دوچار ہوا ہوں۔ واقعی یہ لوگ کلاکار ہوتے ہیں۔
مجھے یاد ہے ایک بار میں اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ پارک کے ایک بنچ پر بیٹھا مونگ پھلی کھا رہا تھا کہ ایک بھکاری میرے پاس آیا۔ بھکاری کے لیے یہ بہترین موقع تھا مجھے پریشان کرنے کا۔ وہ تقاضا کرتا رہا لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ تنگ آکر میں نے کہہ دیا کہ میرے پاس ٹوٹے پیسے نہیں ہیں۔ وہ البتہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ مجبوراً میری منگیتر نے اپنے پرس سے ایک چونی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ بتائی کہ میں عورتوں سے بھیک نہیں لیتا۔ میں نے کہا "کرنی گداگری اور دکھانے نخرے" کہنے لگا: " ہر شخص کا زندگی میں کوئی ایک اصول ہوتا ہے صاحب، اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔" مجبوراً دو روپے کا نوٹ مجھے دینا پڑا۔
میں جب اپنی منگیتر کو بس پر چڑھا کر واپس لوٹا تو اُس بھکاری سے دوبارہ ملاقات

ہو گئی۔ میں نے کہا؟ "کیوں بھائی یہ عورتوں سے بھیک نہ لینے کا اصول کب بنایا"؟ کہنے لگا: "ابھی ابھی۔ ابھی تم نے کہا کہ میرے پاس ٹوٹے پیسے نہیں ہیں تو میں نے سوچا کہ تم سے نوٹ اینٹھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس کا ایک ہی طریقہ نظر آیا کہ لڑکی کی چونی لینے سے انکار کر دوں۔ ایک طرح کا جوا کھیلا میں نے اور دیکھ لو چل گیا۔"

اس سے بھی بڑے آرٹسٹ سے میری ملاقات حال ہی میں امریکہ میں ہوئی تھی۔ آپ نے شاید اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ امریکہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو لوٹ مار کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔ عام طور پر وہ انڈر گراؤنڈ اسٹیشنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ جونہی کوئی تنہا مسافر ان کے ہتھے چڑھ جائے تو اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اور جب وہ زخمی ہو کر گر جاتا ہے تو اس کا بٹوا چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔

کچھ اس شکل وصورت کا ایک شخص میں نے نیویارک کے ایک انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پر دیکھا۔ چھ فٹ قد، بے انتہا اچھی صحت اور چہرا مہرا ایسا کہ دیکھتے ہی دیکھنے والے کا پسینہ چھوٹ جائے۔ لیکن وہ شریفوں کی سی شکل بنائے (جس کے بنانے میں اُسے کافی مشکل ہو رہی تھی) اسٹیشن کے ایک کنارے پر کھڑا آتے جاتے مسافروں سے یوں کہہ رہا تھا:

"میں چاہوں تو آپ کو زخمی کر سکتا ہوں، آپ کے ہاتھ پاؤں توڑ سکتا ہوں آپ کی گردن دبا سکتا ہوں، لیکن میں چونکہ شریف آدمی ہوں، ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں تو صرف یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں سے مجھے صرف ایک ایک ڈالر چاہیئے۔ دیتے ہوئے نکل جایئے۔"

لوگ اس شریف آدمی کو شرافت سے ایک ایک ڈالر دے رہے تھے۔ میں اس کی شرافت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مار پیٹ کرتا تو اس کا دھندا شاید بہت دن نہ چلتا۔ شاید جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی۔ لیکن اس طرح مہینوں وہ روزی پیدا کر سکتا تھا۔ لگتا ہے وہ ہماری زبان نہ جانتے ہوئے بھی اس مثل پر عمل کر رہا تھا۔

"ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا اُترے"

ترقی یافتہ ملکوں میں بھکاری بظاہر اتنے نہیں ہیں جتنے ہمارے ہاں ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہر مندر اور مسجد کے باہر بھکاریوں کا جمِ غفیر ہر وقت مل جاتا ہے۔ لیکن یورپ

میں ایسا نہیں ہے ۔ سڑک پر بھکاری وہاں نظر نہیں آتے ۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بھیک مانگنے کے لیے انھیں بہتر مقام میسر ہیں ۔ مثال کے طور پر ہوٹل کے ویٹر کو لیجیے ۔ آپ نے کھانا کھایا اور اس کے دام چکا دیے ۔ پھر یہ ٹپ کس لیے ؟ آپ کہیں گے کہ ٹپ تو گاہک کی مرضی پر ہے ۔ ٹھیک ہے صاحب ہے تو مرضی پر ۔ لیکن کبھی کسی ہوٹل پر کھانا کھانے کے بعد بغیر ٹپ دیے نکل آیئے ۔ ویٹر آپ کو اپنی نگاہوں کے تیروں سے اس طرح زخمی کرے گا کہ آپ پھر کبھی کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے لائق نہیں رہیں گے ۔ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ تو آپ کو دینا ہی ہے ۔ لیکن ٹپ دیے بغیر آپ اس کی ٹیکسی سے اتر نہیں سکتے ۔

یوں تو ترقی یافتہ ملک کم از کم گداگری کے معاملے میں ہم سے زیادہ ترقی نہیں کر سکے لیکن ایک بات میں وہ ہم سے مار کھاتے ہیں ۔ گداگری جیسے ہماری سرشت میں داخل ہو گئی ہے اس کی مثال شاید وہاں نہ ملے ۔ یہ ہمارے ہاں ہی ہے کہ مضمون نگار کسی رسالے کو مضمون بھیجتے وقت خط میں لکھتا ہے کہ اے مدیرِ محترم اگر آپ اس مضمون کو اپنے موقر جریدے میں جگہ دیں گے تو بندہ زندگی بھر آپ کا ممنون رہے گا ۔ ممنون اصولاً مدیر کو ہونا چاہیے لیکن مضمون نگار اپنی سرشت میں موجود گداگری کا کیا کرے ۔ ہمارے ہاں ہی ہے کہ پورا مہینہ محنت کرنے کے بعد جب کوئی زمیندار اپنے ملازم کو اس کی اُجرت دیتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ حضور کا اقبال بلند ہو ۔ "اقبال بلند ہو" کی دعا تو ملازم کو ملنی چاہیئے ۔ جو اپنی محنت مزدوری کی روٹی کھاتا ہے ، نہ کہ زمیندار کو جو باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائداد پر گلچھرے اڑا رہا ہے ۔ شاید یہ مصرع اسی کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے ۔

بن مانگے موتی ملیں

الجھے ہوئے سوال

کچھ دن پہلے کی بات ہے میں دِلّی کی اجمل خاں روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک جگہ لوگوں کی ایک بھاری بھیڑ دیکھی۔ میں فوراً اُدھر کو ہو لیا۔

آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ بھیڑ ہمارے ہاں دو وجہوں سے اکٹھی ہوتی ہے۔ یا تو وہاں جہاں کوئی چیز سستی بک رہی ہوتی ہے یا پھر وہاں جہاں کوئی تماشا ہو رہا ہوتا ہے ایسی جگہوں پر جانا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی چیز سستی مل رہی ہے تو وہاں جاکر آپ کچھ پیسے بچا سکتے ہیں۔ اور اگر تماشا ہو رہا ہو تو آپ کی بغیر کچھ خرچ کیے تفریح ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں مجھے ونسٹن چرچل کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ چرچل کہیں تقریر کرنے گیا تو دیکھا کہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ چرچل کے ایک دوست نے بھیڑ کو دیکھ کر کہا: "یار ونسٹن، قسمت والے ہو کہ تمھیں اتنے لوگ سننے آئے ہیں"۔ چرچل نے جواب دیا: "ہاں یہ تو ہے، لیکن اگر مجھے اسی ہال میں آج پھانسی دی جا رہی ہوتی تو مجمع اِس سے دُگنا ہوتا کیونکہ پھانسی زیادہ تفریح کا سامان بنتی"۔

چرچل اچھی طرح جانتے تھے کہ لوگ بنیادی طور پر تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ تماشا چاہے سیاسی لیڈروں کی وجہ سے ہو یا بندروں کی اُچھل کود سے۔ چنانچہ میرے قدم خود بخود اس بھیڑ کی طرف اُٹھ گئے۔

قریب جاکر میں نے دیکھا دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے اور کوئی دو سو کے قریب لوگ انہماک سے اُن کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ تماش بینوں کی تعداد سے آپ کو حیرانی نہیں ہونی چاہیئے۔ سو ڈیڑھ سو لوگ تو ہمارے ہاں مرغوں اور مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کے

لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یہاں تو ماشاءاللہ انسان لڑ رہے تھے۔
تماشا کتنا بھی دلچسپ کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی شخص اُسے خراب کرنے کی کوشش سے باز نہیں آتا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ ابھی دونوں لڑنے والوں کے معمولی خراشیں ہی آئیں تھیں کہ ایک بیوقوف بزرگ لڑائی کے میدان میں کود پڑا اور دونوں کے درمیان کھڑا ہو کر کہنے لگا: "آپ دونوں میں جو بھی جھگڑا ہے، اُسے حل کرنے کے لیے لڑائی کا راستہ مت اپنایئے آپ اپنے جھگڑے کا حل بات چیت سے بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔" دونوں نے حیرانی سے اس کا مُنہ تکتے ہوئے کہا: "بزرگوار، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ بات چیت سے ہی ہمارا جھگڑا شروع ہوا۔ ہم دونوں اس فٹ پاتھ پر اپنا اپنا سامان بیچتے ہیں۔ جھگڑا اس بات پر ہے کہ فٹ پاتھ کا یہ کونہ میرا ہے یا اِس کا۔ پہلے اس مسئلے پر بات چیت ہوئی۔ پھر تو تو میں میں ہوئی۔ پھر گالی گلوچ ہوئی اور پھر ہم نے تشدد کا سہارا لیا۔ اب آپ فرما رہے ہیں کہ مسئلہ حل کرنے کے لیے ہم بات چیت کا سہارا لیں۔ بزرگوار، ہم ایک لمبی بحث کے بعد تو اس مقام پر پہنچے ہیں۔ آپ ہمیں پھر سے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔"
میں نے جب دیکھا کہ لڑائی شاید آگے نہ بڑھ سکے، میں وہاں سے کھسک آیا۔ جب تماشا ہی نہیں تو وہاں تماش بین کا کیا کام۔ لیکن بزرگوار کی بات میرے ذہن میں ہچکولے کھاتی رہی کہ کیا جھگڑوں کا حل بات چیت یا مباحثے میں بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے؟۔
مجھے جو تھوڑی بہت سیاسی سمجھ بوجھ ہے وہ کافی ہاؤس کی دین ہے۔ کالج کے زمانے میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ صحیح تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو کافی ہاؤس میں بیٹھا کرو۔ پہلے ہی دن جس گروپ میں جا کر بیٹھا وہاں کمیونزم اور مذہب پر بات چل رہی تھی۔ اپنی طرف سے مناسب موقع دیکھ کر میں نے بھی چونچ کھولی اور کہا: "کمیونزم میں لاکھ بُرائیاں ہوں لیکن انسان دوستی کا جو درس آپ کو اِس سے ملتا ہے وہ مذہب میں نہیں ملتا۔ مذہب تو انسانوں کو بانٹنے میں مصروف رہتا ہے۔" اس پر ایک صاحب نے جن کی شکل وصورت سے عیاں تھا کہ اُن کا ایک خاص مذہب سے تعلق ہے مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہا ذرا باہر آؤ۔
"باہر کیوں؟" میں نے پوچھا "آپ کے پاس اگر میری بات کا جواب ہے تو

یہیں دیجیے۔" کہنے لگے : "یہاں کراکری اور کرسیوں کے ٹوٹنے کا ڈر ہے۔ باہر چلو گے تو صرف تمھاری ہڈیاں ٹوٹیں گی، اور کچھ نہیں۔"

اِس واقعے کے بعد یہ بات میرے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ گئی کہ کافی ہاؤس میں بیٹھ کر بحث کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں کے سیاسی رنگ و روپ کو پہلے سے پہچان لیں۔ یہاں لوگ اپنا نقطۂ نظر بدلنے نہیں، صرف اس کی تشریح کرنے آتے ہیں۔

یہی حال مذہبی بحث کا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما کہتے ہیں کہ مذاہب تو مختلف راستے ہیں۔ منزل تو ہم سب کی ایک ہے۔ یہ تمام راستے اُسی منزل پر پہچانے کے لیے وجود میں آئے ہیں۔

خیر یہ تو منزل پر پہنچ کر ہی پتا چلے گا کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ فی الحال تو اوپر والے کا شکر بجا لانا چاہیئے کہ راستے الگ الگ ہیں۔ راستہ اگر ایک ہی ہوتا تو منزل پر کوئی قسمت والا ہی صحیح سلامت پہنچ پاتا۔

گھر گرہستی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بحث کا مقام وہی ہے جو کھانے کے ساتھ چٹنی کا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی زندگی میں اگر بحث نہ ہو تو ازدواجی زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو لیکن میں نے دیکھا ہے کہ بحث گھروں میں معمولی بات سے شروع ہو کر کہ سالن میں نمک زیادہ ہے یا کم اکثر ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں خاوند لاٹھی اور بیوی بیلن اٹھا لیتی ہے۔ اور اکثر بحث انہی ہتھیاروں کی وجہ سے اختتام کو پہنچتی ہے۔ جب ایک فریق ہسپتال ہی چلا جائے گا تو پھر کیسی بحث اور کونسی بحث۔

ادبی گفتگو عام طور پر ایسے ماحول میں ہونی چاہیئے جہاں نوبت ہاتھا پائی تک نہ آئے۔ لیکن ہم نے وہاں بھی پگڑیاں اُترتے اور جوتے چلتے دیکھے ہیں۔ اِس سلسلے میں خود ہمارے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس پر مرزا غالب کا یہ مصرع آسانی سے فِٹ کیا جا سکتا ہے۔

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہوا یہ کہ ہمارے ایک شاعر دوست تھے جن کی صحیح پہچان یہ تھی کہ وہ ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی۔ اگر کوئی سائل اُن کے

رحم و کرم کا بدلہ چکانا چاہتا تو وہ اُسے کہتے کہ بھائی گھر میں شاعری کی ایک محفل کیوں نہیں منعقد کرتے۔ شاعر کلام سُنا کر اور سامعین سُن کر خوش ہوں گے اور تمھیں دعائیں دیں گے۔

سائل محفل کا انتظام کرتا جس میں شراب اور سامان خورد و نوش اس کا ہوتا اور شعر اور سامعین افسر مذکور کے ہوتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں ہم بھی مدعو تھے۔ نشے کی فراوانی ہی ہوگی کہ ہم سچ بولنے کے موڈ میں آگئے۔ ہمارے دوست نے شعر پڑھا اور ہم نے کہا کہ وزن سے خارج ہے۔ اس نے ایک اور پڑھا اور ہم نے کہا کہ شعر مہمل ہے۔ افسر مذکور نے میزبان کی طرف دیکھا اور میزبان نے اپنے نوکروں کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے آپ کو سڑک پر اِس حالت میں پایا کہ ٹخنہ اس جگہ پر نہیں تھا جہاں معمول کے مطابق اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ مرزا غالب تو صرف بے آبرو ہو کر نکلے تھے ہم بے آبرو اور زخمی حالت میں نکلے تھے۔

زندگی کے سفر میں چلتے چلتے ہم تو اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مسائل کا حل بات چیت کے ذریعے تبھی نکلتا ہے اگر فریقین ایک دوسرے کی بات سننے اور اُسے برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ اپنے بیان کے ثبوت میں میں ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا جو میرے بچپن میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

میں موجودہ پاکستان کے ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں ہمارے گاؤں سے چار میل دور جنگل بیابان میں ایک مسجد تھی۔ اُس مسجد کے نزدیک کوئی آبادی نہیں تھی۔ قیاس غالب ہے کہ کسی اہل ثروت نے اُسے اس لیے وہاں تعمیر کروا دیا ہوگا کہ کوئی مسافر اگر وقتِ نماز اس کے پاس سے گذرے تو نہ صرف نماز پڑھ سکے بلکہ کچھ دیر تک سستا بھی لے۔ لیکن پتا نہیں کس طرح یہ بات ہمارے علاقے میں پھیل گئی کہ یہ مسجد مکہ مدینہ سے چل کر آئی ہے اور وہاں آکر قیام کیا ہے۔

میرے والد کا بھی میری طرح مسخروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک دن کہیں اس مسجد کا ذکر آیا تو اپنے پڑوسی عنایت اللہ سے کہنے لگے: "یار عنایت تم میں اگر ذرا بھی عقل ہو تو بتاؤ کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مسجد مکہ مدینہ سے چلے۔ چلتے چلتے وہ اِس جنگل بیابان میں پہنچے اور پھر یہاں ڈیرا جما لے۔ ایسا ممکن ہے کیا؟"

عنایت اللہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا: "سردار جی میں مانتا ہوں کہ یہ کہانی تبلید

سچی نہیں ہے لیکن آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ آپ جب کہتے ہیں کہ ہنومان پورا پہاڑ اپنی پیٹھ پر اٹھالایا اور راستے میں ایک کنکر بھی گرا نہیں تو ہم تو نہیں کہتے کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ ہماری مسجد کے سفر پر یقین کیوں نہیں کرتے "۔

میرے والد نے ہنستے ہوئے کہا " یار عنایت تم نے سمجھایا ہے تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ یہ مسجد مکے سے چل کر آئی ہے "۔

بات چیت سے مسئلوں کا حل تلاش کرنا ہو تو پہلے دلوں میں محبت کی شمع جلا لینی چاہیئے۔ راستہ صاف سجھائی دے جاتا ہے۔ لوگ بات چیت میں مسائل کا حل تو تلاش کرنا چاہتے ہیں لیکن شمعیں نہیں جلانا چاہتے۔ شاید اس لیے کہ شمعیں اتنی سستی نہیں ہیں جتنی کبھی تھیں۔

لڑکی کا باپ

میری والدہ نے جب یکے بعد دیگرے سات لڑکوں کو جنم دیا تو ایک اُسے ہی کیا، سارے گانو کو یقین ہو گیا کہ پرانے زمانے میں ہمارے کسی بزرگ نے کسی پیر فقیر کی خدمت کی تھی جس کے بدلے میں وہ ہمیں وردان دے گیا کہ اس گھر میں صرف لڑکے ہی پیدا ہوا کریں گے۔ ساتواں تو بعد کی بات ہے یہ نتیجہ تو لوگوں نے چوتھے بچّے کی پیدایش کے بعد ہی نکال لیا تھا۔ میری والدہ بتاتی ہیں کہ جب اُن کے ہاں پانچواں بچّہ پیدا ہونے والا تھا تو لوگ یوں نہیں پوچھتے تھے کہ کیا سردار جی کے ہاں بچّے کا جنم ہو گیا۔ بلکہ یوں پوچھتے تھے کہ سردار جی کے ہاں لڑکے کا جنم ہو گیا کیا؟

میرے والد نے سات لڑکے صرف اس بات کی تصدیق میں پیدا نہ کیے کہ دیکھو پیر کا وردان جھوٹا ہے یا سچا، بلکہ ایک ضرورت کے تحت کیے۔ اچھی خاصی زمینداری تھی اُن کی جسے چلانے کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اور اُن دنوں یہ رواج نہیں تھا کہ بہار سے مزدور پکڑے اور پنجاب میں لے آئے۔ یا پھر جس طرح امریکن یا عرب لوگ کرتے ہیں کہ مزدور غریب ملکوں سے منگوا لیے۔ اُن دنوں مزدور خود پیدا کرنے پڑتے تھے، کیونکہ ہندستان سے زیادہ اور کوئی غریب ملک تھا نہیں، جب میرے والد کو یقین ہو گیا کہ اُن کے ہاں اولاد نرینہ ہی ہوگی تو وہ مزدوروں کی تعداد بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

صرف لڑکے پیدا کرنے کا ایک اور فائدہ بھی ہو گیا۔ انھیں صرف ایک بچّے

کی قمیص سلوانی پڑتی تھی جسے ہم سب باری باری پہن لیتے تھے۔ ایک ہی طرح کے کپڑے سب کے لیے چل جاتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے جوان ہونے تک درزی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ درزی کے پاس صرف بڑے بھائی صاحب جاتے تھے۔ ناپ صرف اُن کا لیا جاتا تھا اور کپڑے ہم سب پہنتے تھے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میرا قد باقیوں سے چھوٹا رہ گیا اور بھائی صاحب کی قمیص میرے گھٹنوں تک آنے لگی۔ چنانچہ ضروری ہوگیا کہ مجھے الگ سے کپڑے سلوا کر دیے جائیں۔ جب میرے والد مجھے درزی کے پاس لے جا رہے تھے تو سارے راستے ڈانٹتے رہے۔ کہتے تھے تو نے جان بوجھ کر اپنے قد کو بڑھنے نہیں دیا کیونکہ تجھے نئی قمیص سلوانے کا بہت شوق تھا۔

قمیص کی تو چھوڑیے کتابیں بھی ہم اسی طرح پڑھتے تھے۔ بھائی صاحب کے لیے خریدلی اور ہم سب نے پڑھ لی۔ مجھے یاد ہے بھائی صاحب ایک دن اپنا جغرافیے کا سبق رٹ رہے تھے کہ سامنے سے ایک بلّی کو جاتے دیکھ کر انھوں نے کتاب بلی پر دے ماری۔ یہ دیکھتے ہی میرا پانچواں بھائی رونے لگا۔ ہم سب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ کتاب بلّی کو ماری گئی ہے، تجھے نہیں۔ تو کیوں رو رہا ہے۔ کہنے لگا اگر بھائی صاحب کتابوں کو اس طرح پھینکتے رہے تو مجھ تک پہنچتے پہنچتے بچے گا کیا؟

میرے والد تو شاید اپنے کھیتوں اور اپنے پریوار کی پیداوار بڑھاتے جاتے کہ اچانک پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ تو دلی منتقل ہوگئے لیکن کھیت وہیں رہ گئے۔ اب حالت یہ ہوگئی کہ مزدور تو ہیں لیکن کارخانہ بند ہوگیا۔ کام کاج کے بغیر تو ہم لوگ صرف نعرے لگانے کے لائق ہی رہ گئے۔ والد صاحب نے عقلمندی یہ کی کہ آدھے مزدور امریکہ بھجوا دیے ورنہ ہم سب کے لیے یہی کام رہ جاتا کہ اُس پیر فقیر کے خلاف نعرے لگاتے رہتے جس کے وردان کی بدولت ہمارا جنم ہوا تھا۔

جب میرے دو بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں اور دونوں کے ہاں تین تین لڑکے پیدا ہوئے تو خود مجھے بھی یقین ہوگیا کہ ہمیں واقعی کسی پیر فقیر کا وردان ملا ہوا ہے۔

دوسرے کے بعد میری شادی ہوئی۔ شادی کے مناسب وقت کے بعد میرے ہاں بچہ ہونا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ جب میری بیوی کو ہسپتال لے جایا گیا تو سب کو

یقین تھا کہ ہوگا تو لڑکا ہی کیونکہ پیر اپنے آپ کو جھوٹا ثابت نہیں ہونے دے گا چنانچہ والد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ لڈو لے کر ہسپتال جانا۔ لڑکے کی پیدائش پر نرسیں اور ڈاکٹر لڈو مانگیں گے۔ پتہ نہیں عین وقت پر حلوائی کی دکان کھلی ملے یا بند۔

میں لڈو لے کر ہسپتال پہنچا۔ ہم سب لوگ میٹرنٹی وارڈ کے باہر کھڑے تھے۔ نرس جب باہر آئی تو میری والدہ نے ہنستے ہوئے پوچھا "لڑکا ہوا ہے نا؟" نرس نے جواب دیا "نہیں ماتا جی لڑکی ہوئی ہے"۔ یہ سنتے ہی سب نے نرس کی طرف کچھ اس طرح سے دیکھا جیسے کہ رہے ہوں کہ ہسپتال میں نوکری کرتی ہو اور لڑکے اور لڑکی میں فرق نہیں پہچانتی۔ جب بار بار پوچھنے پر بھی نرس نے وہی جواب دہرایا تو میرے والد کو یقین ہو گیا کہ ہمارا بچہ بدل دیا گیا ہے۔ پیر فقیر کا وردان اتنے سالوں سے اچھا بھلا کام کر رہا تھا یہ اچانک اُسے کیا ہو گیا؟ چھان بین کرائی گئی تو پتا چلا کہ اُس دن ہسپتال میں صرف ایک ہی بچہ پیدا ہوا تھا اور وہ میری لڑکی تھی۔

سب حیران تھے کہ یہ کیسے ہو گیا۔

میں اور میری بیوی اندر ہی اندر بہت خوش تھے کہ پیر صاحب ہمارے سلسلے میں جھوٹے ثابت ہوئے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہماری دلی خواہش تھی کہ ہمارے یہاں لڑکی پیدا ہو۔ سوسائٹی کو لڑکی کی پیدائش کے خلاف جو شکایتیں تھیں۔ اُن سب سے ہم واقف تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد تھا کہ ہمارے بچپن میں لڑکی کی پیدائش کو گالی سمجھا جاتا تھا۔ میرے سکول کے ہیڈ ماسٹر جب کسی لڑکے پر بہت بگڑتے تھے تو گالی دینے کے انداز میں کہتے تھے "چل لڑکی کا باپ"۔

ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ لڑکی کے بڑا ہونے تک اگر سوسائٹی ویسی ہی رہی جیسی اُس کی پیدائش کے وقت تھی تو ہمیں اُس کی شادی پر خاصا جہیز دینا پڑے گا۔ لیکن ہم دونوں اچھی خاصی ملازمت کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا ویسے بھی سب کچھ اسی لڑکی کے لیے چھوڑ کر جانا ہے۔ اگر جہیز بھی دینا پڑا تو دے دیں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ لڑکی کو گھر میں دیکھ کر میرے والدین بھی خوش تھے۔ میری والدہ سے تو اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ بچی اُن کی گود سے اترتی ہی نہیں تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوتی تھی کہ میری والدہ کے خیالات میں تبدیلی

آگئی ہے۔ شاید یہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر دکھائے جانے والے پروگراموں کا اثر تھا۔

کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ میری والدہ نے ایک دن مجھ سے کہا: "بیٹا پیر فقیروں سے بھی کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے۔ اب دیکھنا دوسری بار تمھارے ہاں لڑکا ہی پیدا ہوگا۔ میں نے کہا "ماں دوسری بار سے تمھارا کیا مطلب ہے۔ ہم صرف ایک ہی اولاد چاہتے تھے سو ہو گئی۔"

یہ سن کر میری والدہ سناٹے میں آگئیں۔ کُل ایک بچہ اور وہ بھی لڑکی۔ یہ وہ برداشت کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بیوی پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ پرانی عورتوں کا دباؤ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک بار کہہ کر چپ ہو گئیں۔ انھوں نے میری بیوی کا جینا محال کر دیا۔ میری بیوی نے بچاؤ کی صورت اسی میں دیکھی کہ ماں کو ڈرایا جائے کہ اگر پھر لڑکی ہو گئی تو؟ ہم حیران رہ گئے جب ماں نے بڑی خندہ پیشانی سے کہا "تو کیا ہوا۔ مجھے پہلی کتنی پسند ہے۔ دوسری کو بھی اسی طرح پیار کروں گی۔"

جب یہ ہتھیار ناکام ہو گیا تو میری بیوی نے دوسرے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیے۔ "بچہ میں پیدا کرنے کو تیار ہوں لیکن اس بار میں سرکاری ہسپتال میں نہیں جاؤں گی۔ میں فلاں نرسنگ ہوم میں جاؤں گی۔" یہ نرسنگ ہوم ہمارے گھر سے قریب ۱۵ کلو میٹر دور تھا اور مہنگا اتنا کہ ایک بچے کی پیدائش پر والد صاحب کی کم از کم ایک ایکڑ زمین بک جاتی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ والدہ خرچ کے خیال سے ڈر جائیں گی لیکن انھوں نے ماتھے پر شکن ڈالے بغیر کہا۔ "روپیا پیسا ہوتا کس لیے ہے۔" انھوں نے نہ صرف اس نرسنگ ہوم میں بندوبست کرا دیا بلکہ کئی دن کے لیے ایک کرایے کی کار ہمارے گھر کے باہر کھڑی کرا دی کہ پتا نہیں کب اچانک نرسنگ ہوم جانا پڑ جائے۔

والدہ نے پیسا پانی کی طرح بہایا لیکن پیر صاحب کا منتر شاید اپنا اثر کھو چکا تھا۔ نرس یہی خبر لے کر آئی کہ لڑکی ہوئی ہے۔ ہم نے سوچا ماں یہ خبر سن کر کھٹیا پکڑ لے گی۔ لیکن کمال یہ ہوا کہ انھوں نے لڑکی کی پیدائش کی خبر کا خندہ پیشانی سے

سواگت کیا۔ کہنے لگیں "بچّہ تو بھگوان کی دین ہے۔ جو اُس نے اچھّا سمجھا دے دیا۔"
ہم حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ساری زندگی جس عورت نے نہ صرف لڑکے کی پیدائش کو متبرک سمجھا ہے، بلکہ خود کر کے دکھایا ہے وہ اپنے ہاں دو پوتیاں کیسے برداشت کر گئی۔

ہم نے باقاعدہ ماں پر نظر رکھنی شروع کر دی ہمیں یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن برس پڑے گی اور ہمیں یا ہماری بچیوں کو کوسنے لگے گی۔ لیکن اُس نے کمال کر دیا۔ اشارے سے بھی کبھی یہ نہیں دکھایا کہ لڑکیوں کی پیدائش کی وجہ سے وہ کسی طرح ناخوش ہے۔

میں نے سوچا پرانی جنریشن میں اتنا بڑا انقلاب آگیا اور دنیا کو پتا ہی نہیں ہے۔ یہ خبر تو سارے ہندستان میں پہنچنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایک مضمون لکھنے کی سوچی۔ سوچا اس مضمون کو ہندستان کے ہر اخبار میں شائع کرواؤں گا۔

ابھی میں مضمون لکھنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ ایک دن ہماری نوکرانی کے خاوند نے آکر اطلاع دی کہ اُس کی بیوی کچھ دن کام کرنے نہیں آسکے گی۔ کہ اُس کے لڑکا ہوا ہے۔ میری والدہ اُس کی آواز سُن کر دوڑتی ہوئی باہر آگئیں اور آکر پوچھا "کون سے نرسنگ ہوم میں تیرا بیٹا پیدا ہوا ہے۔"

نوکرانی کا خاوند کہنے لگا۔ "ہم کہاں نرسنگ ہوم میں جانے کے قابل ہیں اماں۔ اُس کے درد اُٹھا تو میں اُسے کمیٹی کی ڈسپنسری میں لے گیا کہ وہاں پیسے نہیں لگتے۔ وہیں رات اُس نے لڑکے کو جنم دیا۔

میری ماں نے ایک سرد آہ بھری اور پھر اس طرح کہا کہ میں یا میری بیوی سن نہ لیں۔ "قسمت کی بات ہے بھیا۔ لوگ کمیٹی کی ڈسپنسریوں سے بغیر کچھ خرچ کیے لڑکے لے آتے ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ بیس ہزار کھُل گئے لیکن ملی پھر بھی لڑکی ہی۔"

میں نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا لیکن جو مضمون لکھنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا ترک کر دیا۔
میں دیکھتا ہوں کہ میری ماں میری بچیوں کو بہت پیار کرتی ہے۔ لیکن کئی بار میری طرف کچھ اس طرح دیکھتی ہے جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو "چل لڑکی کا باپ۔"

غزل اُس نے چھیڑی....

غزل تو ہم نے تبھی پڑھنی شروع کر دی تھی جب ہمیں اردو پڑھنی آگئی تھی۔ لیکن غزل ہوتی کیا ہے یہ ہمیں تب پتا چلا جب ہم کالج میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے درپردہ باتیں کرنے کے ہیں۔ لغوی معنے جاننے کے بعد ہم نے پڑھی ہوئی غزلوں کو پھر سے پڑھا اور اس بار ذرا زیادہ محنت سے پڑھا۔ عمر کی اُس منزل میں نہ صرف خود عورتوں سے درپردہ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے بلکہ یہ جاننے کی خواہش بھی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ عورتوں کے ساتھ پردے میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔

ہم نے غالبؔ کا سارا دیوان کھنگال دیا۔ داغؔ اور میرؔ کے ایک ایک شعر کو پڑھ گئے لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ شاعر نے عورتوں کے ساتھ پردے میں کیا گفتگو کی، اس کا تو اُن غزلوں میں کہیں نام ونشان نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خود عورتوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ لب ورخسار کی باتیں تو تھیں، زلفِ عنبر بار کی باتیں بھی تھیں لیکن شاعر کے معشوق کے بیشتر نقش ونگار مردوں کے سے تھے۔ مثال کے طور پر اس شعر کو لیجیے۔

زلف لٹکا کے وہ جس دم سرِ بازار چلا
ہر طرف شور اُٹھا مار چلا مار چلا

یہ شعر پڑھ کر ہمارے تصور میں جو معشوق ابھرا وہ کچھ اس طرح کا تھا۔ ایک خوبصورت

بانکا جوان جس نے پتا نہیں کیوں لمبی زلفیں پال رکھی تھیں، ایک دن بازار میں سے جا رہا تھا۔ دیکھنے والوں کو اُس کی مونچھیں تو شاید دکھائی نہیں دیں۔ البتہ زلفوں پر سب کی نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بازار میں ایک ہنگامہ سا ہو گیا۔

بعد میں کسی دوست نے بتایا کہ ہم نے جو سمجھا وہ غلط سمجھا۔ شاعر نے بازار میں عورت ہی کو دیکھا تھا۔ جان بوجھ کر اُس نے اُسے مرد کی شکل دے دی کہ اُس کے گھر والوں سے پٹائی نہ ہو۔ بعین اُسی طرح جیسے ایک عاشق سرلا کو خط لکھے اور لفافے پر پتا سری چند کا لکھ دے۔ مثال کے طور پر اُس نے غالبؔ کا یہ شعر سنایا۔

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

اور کہنے لگا کہ بیوقوف مرد بھی کبھی پری وش ہوتا ہے۔ پری جیسی صورت والے مرد کو تو لوگ کچھ اور ہی سمجھیں گے۔ پھر اُس نے ایک اور شعر کی مدد سے سمجھایا کہ غزل میں باتیں وہی ہوتی ہیں جو عورتوں سے کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

ایسی باتیں کوئی مرد سے کہے گا بھلا۔

بات اب ہمارے پلّے پڑنے لگی۔

ہم نے غالبؔ کے اس شعر کا مزید لطف لینے کے لیے اپنے پروفیسر جناب تلوک چند محرومؔ صاحب سے اِس کے معنی پوچھ لیے۔ محرومؔ صاحب حالانکہ خود اردو میں شاعری کرتے تھے لیکن اُن میں اردو شاعروں والی کوئی عادت نہ تھی۔ سیدھے سادے شریف النفس انسان تھے۔ ایسے انسان جو اگر عشق کرتے بھی ہیں تو اپنی بیوی سے اور اس سے بھی جب در پردہ باتیں کرتے ہیں تو صرف ایسی کہ بھاگوان آج بیگن کا بھُرتا نہ بنانا۔ بہت دنوں سے کھا رہا ہوں، جی اکتا گیا ہے۔"

اُن سے جب ہم نے غالبؔ کے شعر کے معنی پوچھے تو ایسے شرمائے جیسے وہ کلّے پر باندھی ہوئی سلک کی پگڑی سمیت کسی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ کہنے لگے "شعر کا مطلب زیادہ وضاحت طلب نہیں ہے۔ ویسے غالبؔ کو اس طرح کے

شعر نہیں کہنے چاہئیں تھے۔ اچھا نہیں لگتا۔"

ہم نے پوچھا "سر! غالبؔ اگر اس طرح کے شعر نہ کہتا تو پھر غزل کے لغوی معنی سے ناانصافی ہوتی۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ اُس نے ایسے بہت ہی کم شعر کہے ہیں جن سے شک ہوتا ہے کہ اُس کی غزلیں "بس نام" کی غزلیں ہیں "کام کی غزلیں نہیں ہیں۔"

محروم صاحب ہمارا اشارہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے "برخوردار عورتوں سے درپردہ باتوں کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھے ہو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے لطیف عشق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی گلے شکوے، راز و نیاز، روٹھنا منانا، رقیب روسیاہ کی شکایت کرنا وغیرہ۔ یہ ضروری نہیں کہ شعر لکھنے سے پہلے آپ نے یہ سب باتیں اپنے محبوب سے درپردہ کی ہوں۔ صرف پڑھنے والے کو محسوس ہونا چاہیے کہ ایسا کچھ ہوا ہوگا۔ مثال کے طور پر بیخود دہلوی صاحب کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

دل چرا کر لے گئی دزدیدہ نظر دیکھ لیا
ہم نہ کہتے تھے کہ اُس چور نے گھر دیکھ لیا
قد بھی کم، عمر بھی کم، مشقِ ستم اور بھی کم
کر چکے قتل مجھے، جائیے گھر دیکھ لیا

محروم صاحب نے فرمایا کہ عشق کے ساتھ کچھ ضمنی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے اپنی غریبی، دنیا کے ظلم و ستم وغیرہ۔ اسی لیے غزل کے سات شعروں میں تقریباً طے کر دیا گیا ہے کہ ایک شعر میں شاعر معشوق کا سراپا بیان کرے گا۔ ایک میں اُس سے نہ مل سکنے کی شکایت کرے گا۔ ایک میں اپنی مفلسی کا رونا روئے گا، ایک میں بادۂ ناب کا ذکر کرے گا کہ یہ غم بھلانے کی بہترین دوا ہے اور ایک میں آسمان کے ظلم و ستم کا ذکر کرے گا کیونکہ اس "بے وفا" کا عاشقوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے فیض کا یہ شعر پڑھا۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

کہنے لگے اس شعر میں بنیادی طور پر فیض ملازمت نہ ملنے کی شکایت کر رہے ہیں۔

ایسی شکایت عام طور پر حکومت کے ایمپلائمنٹ ایکسچینج سے کرنی چاہیے لیکن غزل کی روایت کی وجہ سے فیض یہ شکایت بذریعہ معشوق کر رہے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "سر بات اب ہماری سمجھ میں آگئی ہے۔ صرف ایک بات کی وضاحت چاہتے ہیں۔ شاعروں کو آسمان کے خلاف کیا شکایت ہے کہ اس کے خلاف بہت سے شعر کہے گئے ہیں۔ کیا انھیں پتا نہیں کہ آسمان تو نظامِ شمسی کا ایک حصہ ہے، وہ عاشقوں یا شاعروں کو پریشان کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ محروم صاحب فرمانے لگے "دنیا دکھوں کا گھر ہے عزیزم۔ یہاں پریشانیوں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ لیکن اگر ان پریشانیوں اور دکھوں کی ذمہ داری کسی اور پر تھوپ دی جائے تو انھیں برداشت کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ شاعر حضرات یہ کام آسمان سے لے رہے ہیں۔" ہم سمجھ گئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے ملک پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو اربابِ حکومت فوراً اعلان کر دیتے ہیں کہ اس آفت کے پیچھے کسی دشمن ملک کا ہاتھ ہے۔

غزل تو شاید یہی روپ دھارے زندگی گزارتی رہتی لیکن جس زندگی کی یہ تصویر کشی کرتی تھی اس میں انقلاب آگیا۔ عورتیں جو پردے میں رہتی تھیں اور جن سے پردے میں کی گئی باتوں پر غزل کی عمارت تعمیر کی گئی تھی وہ پردے کے باہر آگئیں۔ ایسے حالات میں در پردہ باتیں کیسے ہوں۔ ہمیں یاد ہے ہم نے ایک غزل لکھنے کے لیے ایک عورت سے کہا تھا کہ ذرا پردے میں آیئے، آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ کہنے لگی "جو کچھ کہنا ہو یہیں کہہ دو، میں تم جیسوں کے ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہوں۔"

صرف عورت ہی اگر پردے سے نکل آتی تو شاید غزل کا کاروبار چلتا رہتا۔ لیکن ہوا یہ کہ پورے کے پورے سماج میں بڑی اتھل پتھل ہو گئی۔ ہم تو آسمان کو ہی ظالم سمجھ بیٹھے تھے لیکن جب ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم جیسے جفادری بدمعاشوں کے سائنسی درشن ہوئے تو آسمان بیچارہ تو ایک معمولی سا غنڈہ نظر آیا جسے ڈرا دھمکا کر بھگایا جا سکتا ہے۔ معشوق کا سراپا بے معنی سا ہو کر رہ گیا۔ حسن کے تاجروں نے ایسی ایسی ایجادات کو جنم دیا جو قدرت کی بنائی ہوئی بھدی سے بھدی شکل کو حسن عطا کرنے کی شکتی رکھتی ہے۔ حسن کے ان تاجروں کے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ وہ معشوق کو شعروں کی صورت میں طعنہ زنی کرنے لگے۔

یہ رنگ روپ تیرا حمام نے سنوارا
تیرے بدن کی خوشبو حمام سے ہے آئی

ایک بڑا انقلاب یہ آیا کہ عورتیں نہ صرف پردے سے نکل آئیں بلکہ بقلم خود غزل کے میدان میں اتر پڑیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دورِ جدید سے پہلے عورتیں شاعری نہیں کرتی تھیں۔ کرتی تھیں، لیکن بالکل ایسے جیسے مرد کر رہے تھے۔ غزل پڑھ کر پتا نہیں لگتا تھا کہ غزل کسی مرد نے لکھی ہے یا کسی عورت نے۔ لیکن اب جو عورتیں شاعری کے میدان میں اتریں تو اپنی ساریوں اور دوپٹوں کے ساتھ اتریں۔ اور پھر ایسی ایسی باتیں سننے کو ملیں کہ اگر ہمارے پرانے شاعر سن لیتے تو اُن کی شاعری پردے میں پناہ لیتی۔ مثال کے طور پر یہ شعر سنیے:

دھنک کے رنگ میں ساری تو رنگ لی میں نے
اور اب یہ دکھ کہ پہن کر کسے دکھانا ہوا

لیجیے ہمارے شاعر روتے مر گئے کہ وہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اب جا کے معلوم ہوا کہ چھپنا تو درکنار وہ تو اپنی دھنک رنگ ساری دکھانا چاہتے ہیں پر کوئی دیکھنے والا نہیں مل رہا۔ ایک مثال اور ملاحظہ ہو۔

بس یہ ہوا کہ اُس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

ہمارے شاعر تو آج تک ہمیں یہ سمجھاتے رہے کہ رونا دھونا اور آہ وزاری صرف مرد شاعروں کی قسمت میں لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خرابیِ نظر کی وجہ سے اُن کی نگاہ بھیگتے ہوئے دوپٹوں پر نہیں پڑی۔

کچھ ایسے شعر بھی سننے میں آئے جن سے پتا چلا کہ مرد شاعر اپنی معشوقاؤں سے کچھ ایسی توقعات رکھتے رہے جو ناممکنات میں سے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

شاعری میں عورتوں کا داخلہ محض اس لیے بہت بڑا انقلاب ثابت نہ ہوا کہ بہت سی عورتیں ابھی تک شاعری سے زیادہ ضروری کاموں میں مصروف ہیں جیسے

افزائش نسل اور گھر کی جھاڑو صفائی۔ اگر مردوں کی طرح انھوں نے شاعری ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو ہماری روایتی غزل کا کم از کم آدھا حصہ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

جب ہماری زندگی میں مذکورہ بالا انقلاب آیا تو سب سے زیادہ پریشانی مرد شاعروں کو ہوئی۔ جب روایتی مضمون ہی نہ رہے تو اب غزل میں کہیں کیا؟ گھبرا کر کچھ تو نظم کی طرف بھاگے اور اس تیز رفتاری سے بھاگے کہ قافیہ ردیف کی حدیں تک پھلانگ گئے۔ جو غزل سے چمٹے رہے انھیں بہت پریشان ہوئی۔ کئی بار ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسان کی حالت ایک ایسے توتے کی سی ہے جو پنجرے میں رکھیے تو پر پھڑپھڑاتا ہے۔ سلاخوں سے سر پٹکتا ہے۔ اور اگر اسے آزاد کر دیجیے تو اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ جائے تو جائے کہاں۔ یہی حال ہمارے شاعروں کا ہوا۔ جب غزل میں مضامین کی پابندیاں تھیں تو وہ چلا چلا کر کہتے تھے کہ

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور جب آزادی مل گئی تو سمجھ میں نہ آئے کہ کہیں کیا۔ چنانچہ غزل میں نئے پن کے نام پر ایسے ایسے شعر ہوئے کہ خدا کی پناہ

بنا مرغے کے پر جھٹکتی ہیں
مرغیاں در بدر بھٹکتی ہیں
یہ بھی شاعر ہیں اِن کے بالوں میں
فکر و فن کی جوئیں بھٹکتی ہیں

ہمارے مطالعہ میں ابھی تک کسی نئے شاعر کا ایسا کلام تو نہیں آیا جس میں راشن میں چاول کم ملنے یا گرمیوں میں عین دوپہر کے وقت بجلی کے چلے جانے کی شکایت ہو۔ لیکن ایسا شعر ہم نے ضرور پڑھا ہے جس میں مکان الاٹ نہ ہونے کی شکایت ہے۔

شہر میں اپنے ہیں بے نشاں بھی نہیں
سر چھپانے کو لیکن مکاں بھی نہیں

کئی شاعروں کے اشعار میں تو جغرافیہ جیسا خشک مضمون در آیا ہے، جیسے:

یورپ کی بھی دیکھی سحر و شام ولیکن — لاہور کی آزاد! سحر اور ہے شام اور

بڑی سیدھی سی بات ہے کہ جب لاہور یورپ سے دور اور خطِ استوا سے زیادہ قریب ہے تو اُس کی سحر و شام تو یورپ سے الگ ہو گی ہی۔

ہمیں اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ غزل اگر اسی آزادی سے گھومتی رہی تو ایک دن کیمسٹری، فزکس اور بیالوجی جیسے مضامین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ ہم یہ بات اعتراض کے طور پر نہیں کہہ رہے۔ ہم تو خوش ہوں گے اگر ایسا ہو جائے۔ ہم نے یہ مضامین اسکول میں اس لیے نہیں پڑھے تھے کہ دھیان شاعری میں تھا۔ اگر جدید شاعری کی وجہ سے ہم اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر سکیں تو کتنا اچھا ہو۔

نظر لگے نا کہیں...

قدرت کچھ لوگوں کی شکلیں ایسے بناتی ہے کہ انھیں اپنا پیشہ ڈھونڈنے میں ذرا دقت نہیں ہوتی۔ انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ انھیں ایک مخصوص پیشے کے لیے ہی گھڑا گیا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں اپنے ایک دوست کو اپنے ساتھ لے کر ایک پارٹی میں گیا۔ میرے دوست کا حلیہ کچھ اس طرح کا تھا: آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، چہرا ایسا کہ جیسے کبھی ہرا ہوا ہی نہ ہو، جلد ایسی کہ نہا کر بھی نہائی ہوئی نہ لگے۔ میں نے ابھی اس کا کسی سے تعارف بھی نہیں کرایا تھا کہ ایک صاحب نے آکر اُسے کہا: "میں نے آپ کو لال قلعے کے مشاعرے میں سنا تھا۔ میرے دوست نے کہا: "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں شاعر نہیں ہوں۔" اس شخص نے تعجب سے کہا: "حلیے سے تو آپ لگ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر آپ توجہ دیں تو دو چار غزلیں تو آپ ابھی کھڑے کھڑے کہہ سکتے ہیں۔"

حلیے اور پیشے کا امتزاج سب سے زیادہ پولیس والوں میں ہوتا ہے۔ میں نے ہندستان کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں بھی پولیس والے دیکھے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سب ایک ہی ماں کے جنے ہوں۔ سب کا گیارہ نمبر کا پاؤں، سب کی آواز میں کھرج سب کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت جسے دیکھ کر آدمی مُنہ دوسری طرف پھیرے۔ اور سب کی توند ایسی کہ جس پر پیٹی تنگ ہو اور جسے دیکھ کر احساس ہو کہ اللہ کا دیا ہوا کھانے کے علاوہ بھی اس میں کچھ ہے۔ قدرت کی دین کو پولیس والے مونچھ کی مدد سے اور بھی مناسب بنا لیتے ہیں۔ مونچھ تو سمجھ لیجیے ایک طرح سے وردی کا حصّہ بن گئی ہے۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ پولیس والا وردی میں نہ بھی ہو اور آپ اُس کے پیشے کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ صرف میرے دوست سکھ دیو کے معاملہ میں یہ غلطی ہو سکتی ہے۔ اس کی صورت کچھ ایسی ہے کہ خوف کی بجائے اُس پر اعتماد کرنے کو جی کرتا ہے۔ گورا رنگ، بلوری آنکھیں نرم و نازک خدوخال۔ مجموعی طور پر اس کی شکل کچھ ایسی ہے جسے دیکھ کر عورتوں کے دل میں راکھی باندھنے کی خواہش جاگ اٹھتی ہے۔ مجھے کئی بار حیرانی ہوئی کہ ایسا آدمی پولیس میں کیا کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھ ہی لیا تو کہنے لگا: کرتو میں وہی رہا ہوں جو دوسرے پولیس والے کر رہے ہیں لیکن میں اپنی حرکتوں کا چلتا پھرتا اشتہار نہیں لگنا چاہتا۔

میں نے سنا ہے سکھ دیو کا پولیس میں بھرتی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، محض ایک حادثے نے اسے وردی پہنا دی۔ یہ شاید ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔ اُس کے والد مہاراجہ پٹیالہ کے دربار میں ملازم تھے۔ سکھ دیو نے جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو وہ اُسے مہاراج کے دربار میں لے گئے اور درخواست کی کہ سکھ دیو کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا جائے۔ مہاراج نے اپنے وزیر سے پوچھا: "کوئی جگہ خالی ہے کیا؟"

وزیر نے کہا: "جی حضور، پولیس انسپکٹر کی جگہ خالی ہے۔ چنانچہ سکھ دیو کو انسپکٹر بنا دیا گیا۔ بعد میں اُسے جب ایک سابقی انسپکٹر نے بتایا کہ اُسے ۲۵۰ روپے ماہوار تنخواہ ملے گی تو سکھ دیو نے کہا "میں تو تین سو روپے کی نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔" اس پر وہ انسپکٹر ہنسا اور کہنے لگا: " اگر پچاس روپے بھی خود پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو پھر پولیس میں کس لیے آئے ہو۔"

سکھ دیو نے جلد ہی پچاس روپے اپنے زور بازو سے کمانے شروع کر دیے۔

اردو میں بہت سے محاورے ایسے ہیں جن کا مطلب بظاہر کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ اب دیکھیے نا "زور بازو سے پیسے کمانا" سے یوں لگتا ہے جیسے پیسے کماتے کے لیے آپ بازوؤں کا زور لگا رہے ہوں۔ لیکن محاورہ گھڑنے والے کا یہ مطلب نہیں تھا۔ اُس کا مطلب تو محض یہ تھا کہ پیسا خود پیدا کرنا۔ بازو سے کرو یا دماغ سے، اِس سے اُسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سکھ دیو ہمیشہ دماغ کا استعمال کرتا تھا۔

سکھ دیو کو ایک مرتبہ شکایت ملی کہ ایک ہوٹل کو بڑے بڑے لوگ عیاشی کے

لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اُس نے چھاپہ مارا تو ایک بڑا مشہور وکیل ہاتھ لگا جس کے ساتھ ایک ایسی حسینہ تھی جس کا اس کے ساتھ کوئی شرعی رشتہ نہ تھا۔ وکیل سکھ دیو کو دیکھ کر غرّایا۔ "میرے کمرے میں اس طرح گھس آنے کی جرأت تمھیں کیسے ہوئی؟ جانتے ہو یہ عورت کون ہے؟ یہ میری بیوی ہے ہم پر شک کرنے کے جرم میں تمھاری وردی اتروا سکتا ہوں۔" سکھ دیو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "معاف کر دیجیے سر، غلطی ہو گئی۔ آیندہ محتاط رہوں گا" وکیل نے سمجھا اُس نے انسپکٹر کو اُلو بنا لیا۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگا تو سکھ دیو نے نہایت مودبانہ کہا "سر سامنے والے دروازے سے آپ باہر نہ ہی نکلیں تو اچھا ہے۔"

"کیوں نہ نکلوں؟" وکیل نے پوچھا۔

"باہر ایک عورت کھڑی ہے جو عام طور پر آپ کے گھر رہتی ہے اور اپنے آپ کو آپ کی بیوی بتاتی ہے۔"

وکیل گھبرا تو گیا لیکن اتنا بھی نہیں کہ سکھ دیو سے ہار مان جائے۔ بھولپن سے کہنے لگا "کوئی بات نہیں میں پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہوں۔"

سکھ دیو بولا۔ "جناب یہی بہتر رہے گا۔ لیکن اُس طرف اندھیرا بہت ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنا بٹوہ مجھے دے جائیے۔ کسی نے چھین لیا تو خواہ مخواہ پولیس کو بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی۔

وکیل نے پچاس کا نوٹ سکھ دیو کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "صرف شکل سے بھولے لگتے ہو انسپکٹر" اور دونوں ہنس پڑے۔

جب ملک آزاد ہوا تو سکھ دیو کو ہندستان کی پولیس میں لے لیا گیا۔ انسپکٹر سے وہ سپاہی بنا دیا گیا لیکن اُسے کوئی دکھ نہ ہوا کیونکہ یہاں سپاہی کی تنخواہ اُتنی ہی تھی جتنی پٹیالے میں تھانیدار کی تھی۔ اس پولیس میں آئے اسے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ ہوم منسٹر صاحب نے پولیس کے ٹریننگ کیمپ کا دورہ کیا۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"میں آپ سب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندستان اب آزاد ہے۔ درختوں پر جو پتّے ہل رہے ہیں وہ بھی آزاد ہیں اور ملک میں جو ہوا چل رہی ہے، وہ بھی

آزاد ہے" تقریر کا یہ جملہ سکھ دیو کی سمجھ میں نہ آیا لیکن اُس کا اصول تھا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے اُس پر زیادہ دیر غور کرنا بیوقوفی کی علامت ہے کیونکہ غور کرنے کے بعد بھی ایسی باتیں کم ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ لیکن وزیر مذکور کے اگلے فقرے نے اُسے چونکا دیا۔

وزیر صاحب کہہ رہے تھے۔

"آزاد دیش کی پولیس رعایا کی حکمران نہیں ہوتی، رعایا کی خدمت گار ہوتی ہے۔ آج سے کوئی پولیس والا رشوت نہیں لے گا۔"

یہ سنتے ہی سکھ دیو کا سر گھوم گیا۔ "نہیں لے گا تو اُن پچاس روپوں کا فرق پورا کیسے ہوگا جو تنخواہ میں کم مل رہے ہیں؟"

وہ سوچنے لگا۔

سکھ دیو نے ہاتھ اٹھا کر وزیر مذکور کی توجہ اپنی طرف کی اور کہنے لگا۔

"حضور ہم لوگ رشوت کو رشوت سمجھ کر نہیں لے رہے۔ تنخواہ سے چونکہ گھر کا خرچ نہیں چلتا اس لیے کچھ پیسے اپنے زور بازو سے کما لیتے ہیں۔ زور بازو سے کمائی ہوئی رقم کا ہماری بیویوں کو علم ہے اور گھر کا بجٹ اُس رقم کو مدنظر رکھ کر ہی تیار کرتی ہیں۔ میں آپ کی بات مانتا ہوں کہ دیش کی آزادی کے بعد ہمیں بدلنا چاہیے لیکن بیویوں کو سمجھاتے میں کچھ وقت لگے گا۔ اگر ہم فی الحال بالائی آمدنی کا ریٹ کم کر دیں تو کیا آزادی کی ضروریات کسی حد تک پوری ہو جائیں گی؟"

یوں تو سکھ دیو کی بات سن کر اُس کے ساتھیوں نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا لیکن سب دل ہی دل میں اُس سے متفق تھے۔

کچھ سالوں کے بعد سکھ دیو کی تبدیلی دِلّی ہو گئی۔ دلّی میں وہ کئی سال تک جمنا کے پُل پر تعینات رہا۔ اُسے یہ ڈیوٹی بہت پسند تھی۔ یہاں رشوت مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر گزرنے والا ٹرک ڈرائیور خود بخود اُسے دس روپے دے جاتا تھا۔ بالکل ایسے جیسے داماد کو دیکھ کر سسر خوشی خوشی اُس کے ہاتھ میں کچھ دے دیتا ہے۔ لیکن پتا نہیں کس کی نظر اُسے کھا گئی کہ ایک دن اُس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ اب اُس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ایک سرکاری دفتر کے باہر کاروں کو ترتیب سے پارک کروانا۔ میں چونکہ اُسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ اِس لیے ہماری ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ میں نے اُسے

مبارک باد دیتے ہوئے کہا: "سکھ دیو، خوشی کی بات ہے کہ تمہیں اب بہت ہی آسان ڈیوٹی دے دی گئی ہے۔" کہنے لگا "ڈیوٹی تو آسان ہے لیکن وہ جو میری تنخواہ میں تھوڑی سی کمی ہے اُسے پورا کرنا یہاں مشکل ہو رہا ہے۔" میں نے مذاقاً کہا "مشکل یا ناممکن؟" کہنے لگا "ناممکن کیسے ہو سکتا ہے" روٹی کا پربندھ تو اوپر والے نے کرنے کا وعدہ کر ہی رکھا ہے۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ دیہاتی حلیے کے ایک آدمی کو اُس نے راشٹرپتی کے بھون کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ سکھ دیو نے پوچھا "کدھر جاتے ہو؟"

حالانکہ سکھ دیو کی آواز میں رعب کا نام و نشان نہیں تھا لیکن دیہاتی اُس کی وردی دیکھ کر ہی گھبرا گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "جناب میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں، لیکن اندر کہاں گھسے جا رہے ہو؟"

"ایسے ہے جناب کہ میرے ہاں لڑکیاں تو چار پیدا ہو چکی ہیں لیکن لڑکے کی تمنا میں اب تک در بدر بھٹک رہا ہوں۔ ایک پنڈت نے مشورہ دیا ہے کہ ہون کراؤ اور اُس ہون میں سات راج محلوں کی مٹی ڈالو۔ میں تو راشٹرپتی بھون سے مٹھی بھر مٹی لینے آیا ہوں۔"

سکھ دیو نے تو جیسے اپنے مُنہ میں مصری کی ڈلی رکھ لی۔ کہنے لگا "بھائی مٹی لے جا رہے ہو تو لڑکا تو ہو گا ہی۔ لیکن ہمارا مُنہ میٹھا تو نہیں ہو گا نا۔"

"کیا کہہ رہے ہو جناب۔ لڑکا پیدا ہو جائے تو میں مٹھائی کا ٹوکرا لے کر خود آپ کے پاس آؤں گا۔"

"پتا نہیں اُس وقت میری ڈیوٹی کہاں ہو گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ لڑکے کے چاچا کو آج ہی لڈو کھلا دو۔"

دیہاتی نے اُس کا مشورہ قبول کیا اور بیس روپے اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ سکھ دیو نے میری طرف دیکھا اور مونچھوں میں مسکراتے ہوئے کہا "اب صرف تیس اور پیدا کرنے ہیں۔"

کئی سال گزر گئے۔ میرا سکھ دیو سے تعلق ٹوٹ گیا۔ پھر ایک دن اچانک

اُس سے ملاقات ہو گئی۔ ہمارا ایک دوست پاکستان سے ایک مشاعرہ پڑھنے دِلّی آیا تھا۔ قانون کے مطابق اُسے کسی تھانے میں حاضری دینی تھی۔ میں اُسے ساتھ لے کر جب پارلیمنٹ اسٹریٹ کے تھانے میں گیا تو دیکھ کر خوش ہوا کہ تھانے کا انچارج سکھ دیو تھا۔ بڑی محبت سے ملا۔ پوچھا کیسے آئے ہو؟

میں نے قتیل سے تعارف کروایا اور اپنا مدعا بیان کیا۔

سکھ دیو نے قتیل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "قتیل صاحب میں بھی شاعر ہوں"، اور پھر اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "جیسے آپ لوگ دو الگ الگ مصرعوں کو جوڑ کر ایک شعر بنا لیتے ہو، ہم لوگ دو اور دو جوڑ کر ملزم کو پکڑ لیتے ہیں۔"

ہم سب ہنسنے لگے۔

سکھ دیو نے ہمارا کام فوراً کروا دیا۔ چائے سے خاطر بھی کی اور پھر پوچھا "کوئی اور خدمت میرے لائق؟"

میں نے سوچا پولیس والے سے کیا خدمت لی جا سکتی ہے۔ پھر میری مزاح کی حس پھڑکی اور میں نے کہا:

"اور یہ ہے یار کہ ہمیں حوالات میں بند کر دو۔"

سکھ دیو نے بغیر گھبرائے ایک جاتے ہوئے حوالدار سے پوچھا: "کیوں ریشم سنگھ کوئی حوالات خالی ہے کیا؟ ہمارے یار کو ایک رات کے لیے بند کر دو۔"

حوالدار نے پوچھا "کون سی دفعہ کے اندر؟"

"ارے یار ایک دوست نے درخواست کی ہے، ہم انکار تو نہیں کر سکتے۔ دفعہ کا کیا ہے۔ انڈین پینل کوڈ اتنی بڑی کتاب ہے کوئی نہ کوئی دفعہ ہمارے یار کے اوپر فٹ ہو جائے گی۔"

سچی بات یہ ہے کہ میرے ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ میرے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہو گئے۔ سکھ دیو میری حالت دیکھ کر مسکرانے لگا۔ کہنے لگا۔

"یار تم خواہ مخواہ گھبرا گئے۔ میں نے رات رکھنے کے بعد تمہیں ضمانت پر رہا کر دینا

تھا۔ اس سے مجھے بھی کچھ فائدہ ہو جاتا۔"

"تمھیں اس میں کیا فائدہ ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"یار جو تمھاری ضمانت دینے آتا وہ تمھاری طرح خالی ہاتھ تو نہ آتا۔ اُسے یقیناً پتا ہوتا کہ میری تنخواہ میں جو کمی ہے اُسے پورا کرنا یار دوستوں کا فرض ہے۔"

ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پتا نہیں کیوں مجھے میری اپنی ہنسی بناوٹی سی لگ رہی تھی۔

جنم دن کی تلاش

مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میں کس دن پیدا ہوا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم کرنے کی کبھی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ جس معاشرے میں میں پیدا ہوا تھا وہاں جنم دن نہیں منائے جاتے تھے۔ یہ تو نہیں ہے کہ وہاں منایا ہی کچھ نہیں جاتا تھا۔ منائے تو کئی دن جاتے تھے لیکن اُن کا میرے وجود سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثال کے طور پر میرے گاؤں میں گھڑے والے پیر کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ آج تک میں نہیں جان سکا کہ گھڑے والا پیر کون تھا اور اُس کا عرس کیوں منایا جاتا تھا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ ایک کھلے میدان میں ایک قبر تھی جس پر ایک گھڑا اُلٹا رکھا تھا۔ ہر سال ایک خاص دن پر اِس قبر کے ارد گرد ایک میلا لگتا تھا جہاں جلیبیاں، ریوڑیاں اور بتاشے بکتے تھے۔ ہمارے والد ہم سب بچوں کو لے کر وہاں جاتے تھے اور خاص طور پر یہ چیزیں خرید کر ہمیں کھلاتے تھے۔ کبھی کسی نے یہ نہیں بتایا کہ گھڑے والا پیر تھا کون۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ قبر کسی پیر کی ہے ہی نہیں۔ کئی لوگ تو سوچتے تھے کہ یہ قبر ہی نہیں ہے۔ یوں ہی سا مٹی کا تودا ہے جس پر کوئی گھڑا رکھ کر بھول گیا ہے۔ لیکن کوئی اپنے خیالات کو الفاظ کی شکل نہیں دیتا تھا کہ کہیں یہ میلا بند نہ ہو جائے اور جی بھر کر جلیبیاں کھانے کا موقعہ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ایسے کئی اور دن بھی تھے جب ہمارے ہاں جشن منایا جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے چاچے اللہ دتے کی گھوڑی جس دن مری تھی تو ہمارے گھر میں بڑا جشن ہوا تھا۔ یہ گھوڑی میرے والد کی گھوڑی سے زیادہ تیز رفتار تھی اور جب بھی کبھی گاؤں

میں گھوڑ دوڑ کا مقابلہ ہوتا تھا یہ میرے والد کی گھوڑی سے آگے نکل جاتی تھی۔ اللہ دتے کی گھوڑی کے مرنے کی خبر سنتے ہی ہمارے گھر میں حلوہ بننا شروع ہو گیا تھا۔ اور جب تک اللہ دتہ گھوڑی کا سوگ مناتا رہا، ہمارے ہاں باقاعدگی سے حلوہ بنتا رہا۔

میرے بچپن میں اور بھی کئی دن تھے جو بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ کانے گوپالے کی شادی جب سوئیاں والے کے رام چندر کی لڑکی سے طے ہو گئی تو ہمارے پورے گاؤں میں جشن ہوا تھا۔ جشن اس خوشی میں ہوا کہ ہمارے گاؤں کا کانا گوپالا بھی کھوٹے سکے کی طرح چل گیا۔ کسی نے رام چندر کی لڑکی کے بارے میں نہ سوچا کہ اُس بچاری پر کیا گزر رہی ہے۔ جشن تو دیکھیے نا جب بھی منایا جائے گا، کسی اور کو تھوڑی بہت تکلیف تو ہو گی ہی۔ ایسا جشن تو آج تک ایجاد نہیں ہوا جسے ساری دنیا مل کر منا سکے۔ ہیروشما پر جب بم گرا تھا تو اتحادیوں نے جشن منایا تھا کہ ہم نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کر لی ہے۔ لیکن اُس جشن میں جاپانی شریک نہ ہو سکے، شریک کیسے ہوتے، وہ تو اب تھے ہی نہیں۔ اور پھر جشن تو تھا ہی اِس بات کا کہ جاپانی اب نہیں رہے تھے۔

چنانچہ جشن منانے کے لیے کسی کو میرا جنم دن جاننے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اور جب جشن ہی نہیں منانا تو پھر یہ جاننے کی ضرورت کہاں کہ میں کب پیدا ہوا۔

یہ نہیں ہے کہ میرا جنم دن جاننے کی کبھی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے اسکول میں داخل کرانا تھا تو میرا جنم دن جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ ہمارے گھر میں اُس دن کوئی تقریب تھی۔ شاید پڑوسی کی بھینس مر گئی تھی یا پھر اسی طرح کا کوئی خوشی کا دن تھا۔ اسی لیے میرے والد صاحب میرے ساتھ اسکول نہ آ سکے۔ مجھے اپنے ایک دوست چوہدری عنایت اللہ کے ساتھ بھیج دیا کہ جا یار لڑکے کو اسکول میں بھرتی کرا دے۔ گھر میں دن بھر پریشان کرتا ہے۔ میرا اسکول میں داخلہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے ہماری بھینس کو شیرے چھیڑو کے مال میں بھرتی کرایا گیا تھا۔ شیرا جب گاؤں کے ڈنگر جنگل میں چرانے لے جا رہا تھا تو والد صاحب نے اپنی بھینس کا رستہ اتار کر شیرے کو کہا "لے یار ہماری بھینس کو بھی

بھرتی کرے، سارا دن طویلے میں اُڑاتی رہتی ہے۔

جب اسکول ماسٹر نے میری عمر پوچھی تو چاچے عنایت نے یہ نہیں کہا کہ اس کے باپ سے پوچھ کر بتادوں گا۔ بلکہ ماسٹر سے پوچھا کہ کتنے سال کا لڑکا ہو تو لیتے ہو۔ ماسٹر نے کہا "پانچ سال کا۔"

"تو بھائی پانچ سال کا تو یہ ہے۔ جنم دن تم نکال لو کہ پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

گاؤں کے لوگوں کی یہی بات مجھے بہت پسند ہے۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے اُن کا دماغ خوب چلتا ہے اور وہ ایسی ایسی چیزیں اختراع کر لیتے ہیں جو پڑھا لکھا اس لیے نہیں سوچ پاتا کہ اُس نے یہ بات کسی کتاب میں نہیں پڑھی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں چوتھی جماعت میں تھا تو اسکول میں انسپکٹر آیا۔ جب بھی گاؤں میں کوئی سرکاری آدمی آتا تھا، گاؤں کے رتبہ یافتہ لوگ اُس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ چوہدری عنایت اللہ جو ہمارے گاؤں کا نمبردار تھا، انسپکٹر کے ساتھ اسکول میں موجود تھا۔ انسپکٹر نے ہمیں کہا "اپنی تختی پر اپنا نام، اپنے باپ کا نام اور اپنے دادا کا نام خوشخط لکھو۔ میری خوش خطی کے تو سارے اسکول میں چرچے یہاں تک تھے کہ بھدے خط والے لڑکوں کو میری ہی تختی سے پیٹا جاتا تھا۔ لیکن اُس دن میرا قلم تختی پر چل نہیں رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اپنے دادا کا نام یاد نہیں تھا میرے ماسٹر اور چاچے عنایت کی آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں کہ میری ہی تختی انسپکٹر کو دکھائیں گے۔ میرا ہاتھ رُکا دیکھ کر چاچے کو تشویش ہوئی کہ یہ لکھ کیوں نہیں رہا۔ میرے پاس آکر سرگوشی میں کہنے لگا۔ "ادئے کھوتے کے کن لکھتا کیوں نہیں۔" میں نے کہا "چاچا مجھے اپنے دادا کا نام معلوم نہیں۔" چاچا عنایت کچھ دیر تک اپنے دانتوں کو ایک تنکے سے کرید کر سوچتا رہا۔ لگ رہا تھا کہ نام اُسے بھی یاد نہیں آرہا۔ پھر کہنے لگا۔ "لکھ دے بشن سنگھ" میں نے کہا "چاچا، وہ تو میرے تائے کا نام ہے۔" کہنے لگا "تو لکھ دے۔ انسپکٹر نے خوش خطی دیکھنی ہے۔ وہ کون سا تیرے دادا کے نام زمین لکھوا رہا ہے۔"

دوسری بار مجھے اپنا جنم دن جاننے کی ضرورت اُس دن محسوس ہوئی جب مجھے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد میں پاکستان سے ہجرت

کر کے دلّی آ گیا تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی نے مہاجر طلبہ کے لیے ایک اسپیشل امتحان کا بندوبست کیا۔ پاکستان میں رہتا تو اُس سال مجھے نویں جماعت میں ہونا تھا۔ لیکن میرے والد کا خیال تھا کہ موقعہ کا فائدہ اٹھا کر اگر اب دسویں پاس کر لوں تو آسانی سے کسی کام دھندے میں لگ جاؤں گا۔

امتحان کے فارم میں جنم دن لکھنا ضروری تھا۔ اس بار فارم بھرنے کے وقت میرا بڑا بھائی ساتھ تھا۔ کہنے لگا جنم دن اس طرح کا بنا کہ تو سولہ سال کا ہو جائے تاکہ تجھے امتحان میں بیٹھنے دیں۔ میں نے کہا تو ہی بنا دے۔ اُسی کے مشورے اور مدد سے میں نے ایک مناسب جنم دن چُن لیا جو یقیناً پہلے والے جنم دن سے مختلف تھا۔ اس نئے جنم دن کی بنا پر میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اِسی کی بنا پر ملازمت کی اور اِسی کی بنا پر ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

اس طرح صحیح جنم دن جانے بغیر میرا دنیاوی کاروبار چل رہا تھا کہ ایک دن پھر مجھے جنم دن جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملازمت میں کچھ سال ایسے آئے کہ میں گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح ایک ہی رتبے پر اٹک گیا۔ موقعے آتے رہے لیکن سرکار نے مجھے ترقی دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے ہر لمحہ یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ میری ترقی کب ہوگی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کسی جیوتشی سے مشورہ کرو۔ جیوتشی ڈھونڈا تو اُس نے کہا کہ جب تک صحیح جنم دن نہیں بتاؤ گے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ چنانچہ میں پھر سے جنم دن کی تلاش میں نکل پڑا۔

لے دے کے ایک ماں تھی جسے معلوم ہو سکتا تھا کہ میں کب پیدا ہوا۔ لیکن وہ بچاری کیا کرے۔ آٹھ بچے پیدا کرنے کے بعد اُسے اُن کے نام بھول جاتے تھے، جنم دن کیسے یاد رکھتی۔ نشانیاں تو کچھ کچھ اُسے یاد تھیں کہ اُس دن بارش بڑی زوردار ہوئی تھی اور گلیوں میں کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ لیکن ان نشانیوں کی بنا پر جنم دن ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا کیونکہ سال کا ایسا کون سا دن ہے جب ہماری گلیوں میں کیچڑ نہیں ہوتا۔ اور بارش کا ہمارے ہاں یہ حال ہے کہ اگر برسنے پر آ جائے تو کسی مہینے میں بھی برس پڑے اور اگر نہ برسے تو کئی کئی سال نہ برسے۔

ایک دن میں دفتر سے گھر لوٹا تو میرے بچے مجھے ضرورت سے زیادہ خوش نظر آئے۔

گھر میں جشن کی سی تیاریاں تھیں۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟" کہنے لگے "دادی اماں نے تمھارا جنم دن ڈھونڈ لیا ہے۔" سنتے ہی میری طبیعت خوش ہو گئی۔ چنانچہ میں بھی اُن کے جشن میں شامل ہو گیا۔ ماں نے بتایا کہ میں ساون کی بائیس تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ حساب لگایا تو اگست کی اٹھارہ نکلی۔ میں نے فیصلہ کیا کل صبح ہی جیوتشی کے پاس جاؤں گا اور اپنی ترقی کی تاریخ کا پتا کر کے آؤں گا۔ لیکن میرے بچوں نے بتایا کہ جیوتشی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی کے ہر رسالے میں ایک صفحہ ایسا ہوتا ہے جہاں لکھا ہوتا ہے کہ اٹھارہ اگست کو پیدا ہونے والے کی قسمت میں یہ ہفتہ کیسا ہوگا۔

رسالہ نکال کر پڑھا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ صاف لکھا تھا کہ ملازمت میں ترقی ہو گی۔

اگلا دن اتوار تھا۔ میں نے سوچا اگر سوموار ہوتا تو ترقی کا حکم نامہ کل ہی مل جاتا۔ خیر کل ایک دن کی بات تھی۔ چنانچہ ہم لوگ جشن کی تیاری میں لگ گئے۔

سوموار جب میں دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ میرا افسر مجھے صبح سے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "بچو اب تو تلاش کرو گے ہی۔ اب میں نے اپنا جنم دن جو تلاش کر لیا ہے۔ اب تمھارے فیصلے کی خبر تم سے پہلے مجھے ہوا کرے گی!"

میں جب اُس کے کمرے میں پہنچا تو میں نے کہا "سناؤ بھئی چڈھا کیا حال ہے تمھارا؟"

وہ حیران کہ میں نے اُسے چڈھا صاحب کیوں نہیں کہا۔ کہنے لگا "تمیز سے بات کرو۔"

میں نے کہا "چھوڑ یار۔ برابر والوں میں یہ تکلفات نہیں ہونے چاہئیں۔"

کہنے لگا "تو میرے برابر کا کیسے ہو گیا؟"

میں نے کہا "جوں ہی میری ترقی کے آرڈرز میرے ہاتھوں میں تھاؤ گے، ہم دونوں برابر ہو جائیں گے۔ اور مجھے پتا ہے کہ تم نے مجھے ترقی کے آرڈرز دینے کے لیے بلایا ہے۔"

"کون سی ترقی" وہ چلایا "دور ہو جاؤ میری نظروں سے تم زندگی بھر میرے برابر نہیں ہو سکو گے"
دن بھر تو میں اس ملاقات کو ایک مذاق ہی سمجھتا رہا۔ لیکن جب شام کو وارننگ ملی تو مجھے شک ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ شاید ماں نے میرا جنم دن ڈھونڈنے میں حساب کچھ غلط لگایا ہے۔ گھر آ کر میں نے پوچھا۔
"ماں کیا تمھیں اچھی طرح یاد ہے کہ میرا جنم ساون کی بائیس تاریخ کو ہوا تھا"
"ہاں"
میں نے پوچھا "کیا تمھیں اندر جیت کا جنم دن یاد ہے؟ کیا نرندر کا یاد ہے؟ کیا اقبال سنگھ کا یاد ہے؟"
"نہیں" ماں بولی۔
"تو پھر میرا کیسے یاد رہ گیا؟"
کہنے لگی کیا پتا یہ تیرا ہے یا کسی اور کا۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ ساون کی بائیس کو تم میں سے کسی ایک کا جنم ہوا تھا۔ اس کا رنگ کالا سا تھا، میں نے سوچا تیرا ہی ہوگا"
میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔
دو تین سالوں کے بعد میری اپنے آپ ترقی ہو گئی۔ دو ایک سالوں کے بعد ریٹائرمنٹ بھی ہو جائے گی لیکن صحیح دن کا پتا مجھے ابھی تک نہیں چل سکا۔
کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اگر مجھے صحیح جنم دن کا پتا چل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس طرح میں بھی اپنا جنم دن منا لیتا۔ ساٹھواں ہی سہی۔ جب اس خواہش کا ذکر میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے کیا تو کہنے لگا "اب کیا جنم دن مناؤ گے۔ اب تو آخری سفر کی تیاری کا سوچو۔ ہاں اتنا ہم تجھے یقین دلائے دیتے ہیں کہ تمھاری موت کی تاریخ اور وقت اچھی طرح نوٹ کر لیں گے"
"اس سے کیا فائدہ ہوگا" میں نے پوچھا۔
کہنے لگا "جنم دن نہ سہی تمھاری برسی تو منا سکیں گے ہم لوگ سوال تو جشن منانے کا ہے۔ یہ نہ سہی وہ سہی۔

نارمل آدمی

کئی سال پہلے کی بات ہے دلی میں میرا لکھا ہوا ایک ڈراما اسٹیج ہوا تھا جو پبلک کو بہت پسند آیا۔ اس سلسلے میں انگریزی کے ایک اخبار کی نامہ نگار ایک حسین لڑکی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرا انٹرویو لینا چاہتی ہے۔ ملاقات دلی کے کافی ہاؤس میں طے پائی۔

اس نامہ نگار لڑکی کے تعارف میں میں اتنا عرض کر دوں کہ اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ کافی ہاؤس میں بہت سے لوگ وہاں صرف اسے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ویٹرز کرسیوں کو کسی بھی انداز سے سجائیں یا لا آخر ان کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہو جاتی تھی کہ کافی ہاؤس کا ہر گاہک اس حسینہ کو دیکھ سکے۔ صحیح انداز سے نہ سہی، غلط انداز سے ہی سہی۔

حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اُسے قابلیت کے دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ دانشور کہتے ہیں کہ حسن و عقل کا آپس میں تعلق نہیں ہوتا۔ یہ لڑکی اِس غلط بیانی کا زندہ ثبوت تھی ویسے بھی میرا خیال ہے یہ قول ہمارے دانشوروں نے محض اس لیے گھڑ لیا ہے کہ عقل کے بارے میں تو انھوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ اُن کے پاس ہے اور حسن کے بارے میں آئینہ انھیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ ہر چند کہو کہ ہے نہیں ہے۔

اِس مختصر سی تمہید کے بعد میرا خیال ہے میں اپنے انٹرویو کی طرف لوٹ آؤں ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس مضمون کا اصل موضوع میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

مجھے یاد ہے کافی ہاؤس میں کئی بار ایک گروپ میں زور و شور سے کمیونزم پر بحث ہو رہی ہوتی تھی کہ اچانک اُس لڑکی کے کافی ہاؤس میں داخل ہونے سے اُس میز پر یا تو مکمل خاموشی چھا جاتی تھی یا پھر اچانک غزل گوئی شروع ہو جاتی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ جس موضوع پر لکھنے کو میں نے قلم اٹھایا ہے اُسے بھول کر غزل سرائی شروع کر دوں۔

انٹرویو کے شروع میں ہی مجھے احساس ہوا کہ کچھ جم نہیں رہا۔ اصل میں انٹرویو تو تب جمتا ہے جب دونوں، انٹرویو دینے والا اور انٹرویو لینے والا ایک ہی منزل پر رواں دواں ہوں۔ ہم دونوں تو دو الگ الگ راہوں پر گامزن تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ انٹرویو کچھ اس طرح کا ہو کہ لوگ چٹخارے لے کر پڑھیں میں چاہتا تھا کہ اس مختصر سی ملاقات کی آڑ لے کر اس حسینہ پر اپنی قابلیت، اپنی دولت، اپنی شہرت اور خاندانی جاہ و حشمت کا سکہ بٹھا دوں۔ انٹرویو جم کیسے سکتا تھا۔

لڑکی نے میرے بچپن کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے کہا "چوں کہ آپ کی پیدائش ایک گاؤں میں ہوئی تھی اس لیے آپ کو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا"۔

کرنا تو پڑا تھا کہ والد ہر روز صبح مجھے گھر سے پیدل نکال دیتے تھے۔ لیکن اُس وقت مجھ پر ایک حسین لڑکی کو مرعوب کرنے کا نشہ سوار تھا اس لیے میں نے بچپن کی مشکلوں کو پس پردہ ڈال کر کہا۔

"تعلیم حاصل کرنے میں مشکل کیا ہوتی تھی۔ والد صاحب بڑے زمیندار تھے۔ کئی گھوڑے تھے اُن کے پاس۔ صبح سائیس مجھے گھوڑے پر بٹھا کر شہر لے جاتا تھا اور جب تک میں اسکول میں رہتا تھا وہ باہر بیٹھا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں اندر آکر پوچھ لیتا تھا کہ کسی لڑکے نے میری پنسل تو نہیں چھینی یا کسی ٹیچر نے مجھ سے بدسلوکی تو نہیں کی"۔

میں نے سب کچھ اس طرح سے کہا کہ خود مجھے اپنے بیان پر یقین ہونے لگا کچھ دیر کے لیے میں بھول گیا کہ میں کافی ہاؤس میں داخل ہونے سے پہلے اسٹینڈ پر اپنی سائکل رکھ کر آیا ہوں۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرا ڈرائیور میری امپورٹیڈ کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے کہ انٹرویو ختم ہو تو مجھے گھر لے جائے۔

مجھے تو اپنے جواب سے خوشی ہوئی لیکن لڑکی کے چہرے پر مجھے مایوسی کی ایک ہلکی سی پرچھائیں دکھائی دی۔

پھر اس نے پوچھا۔ "لکھتے وقت آپ کو کس طرح کا ماحول اور کون سی سہولتیں درکار ہوتی ہیں"۔

اس کا خیال تھا میں اُس ماحول کا اور اُن چیزوں کا ذکر کروں گا جو عمر خیام کو درکار

تھیں یعنی ایک حسین رقاصہ کا ساتھ، صراحی اور جام اور تنہائی لیکن میں ایسا جواب کیوں دیتا۔ میں تو اپنے آپ کو نہ صرف عمر خیام سے بلکہ ہر ادیب سے الگ سا محسوس کر رہا تھا اس لیے میں نے جواب دیا کہ لکھنے کو کچھ ہونا چاہیے میں کہیں بھی بیٹھ کر لکھ سکتا ہوں۔ سہولت کے بارے میں میں نے کہا کہ لکھتے وقت میرے پاس سفید کاغذ اور قلم ہونا چاہیے۔ بس۔ سہولیت تو اُسے چاہیے جو سوچ سوچ کر لکھتا ہو۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ: آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

میرا جواب سُن کر لڑکی کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں اور گہری ہو گئیں۔

اس نے مجھ سے کئی اور سوال کیے ایک سوال یہ تھا کہ ضرور میرا کوئی چچا بڑا ظالم ہو گا کیونکہ میرے ڈراموں میں اکثر ظالم چچاؤں کا ذکر ہوتا ہے۔

میں کیسے تسلیم کرتا کہ میرے خاندان میں کوئی جابر شخص تھا۔ میں نے جواب دیا کہ جس خاندان سے میرا تعلق ہے وہاں تو گلی کے کتّے سے بات کرتے وقت اُسے "آپ" کے القاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ایسے خاندان میں کسی جابر کی پیدائش کیسے ممکن تھی۔ وہ تو جب ہم لوگ ملک کی تقسیم کے بعد اپنی قلعہ نما کوٹھی چھوڑ کر مجبوراً دلی آئے تو کچھ ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو جابر اور ظالم تھے۔ انھی کی تصویر کشی میں نے اپنے ڈراموں اور مضامین میں کی ہے۔

انٹرویو کچھ اسی انداز سے چلتا رہا وہ مجھے پھسلاتی رہی کہ میں کوئی ایسی بات کہوں جس سے انٹرویو میں رنگ بھرا جا سکے۔ میں اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح اسے یقین دلا سکوں کہ سو برس سے بزرگ میرے حکمراں تھے۔

جب اُس نے پوچھا کہ میرے والد نے میری پہلی تخلیق پر مجھے خوب پیٹا ہوگا کہ میں اتنے بڑے زمیندار کا بیٹا ہو کر ڈرامے لکھتا ہوں تو میں نے کہا "نہیں۔ انھوں نے سارے علاقے میں لڈو بانٹے تھے کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرح ان پڑھ تھا، ان کا لڑکا ایک دن دیکھنا شیکسپئر کو پچھاڑ کر دم لے گا۔"

"اس قدرتی عطیے کے باوجود اپنا پہلا ڈراما براڈکاسٹ کرانے کے لیے آپ نے کئی سال ریڈیو اسٹیشن کے گرد طواف کیا ہوگا۔" اس نے پوچھا۔

"میں نے تو ڈراما ڈاک سے بھیجا تھا۔ خود ریڈیو اسٹیشن سے ایک افسر میرے گھر آ کر کہہ گیا تھا کہ صاحب اس سے بہتر ڈراما ہم نے آج تک نہیں پڑھا۔" میں نے

جواب دیا۔
"آپ کی بیوی ضرور کہتی ہوگی کہ لکھنا لکھانا چھوڑ کر راشن کی دکان کھول لو تاکہ گھر میں چولہا جلتا رہے۔" اس نے پوچھا۔
میری بیوی کہتی ہے کہ تم خوب شہرت حاصل کرو۔ روٹیاں ہم بازار سے لے آیا کریں گے چولہا جلانے سے ویسے بھی گھر میں دھواں پھیلے گا" میں نے جواب دیا۔
مختصر یہ کہ میں نے بار بار اسے یقین دلایا کہ میری زندگی میں کوئی ناخوشگواری نہیں ہوئی اگر کبھی کوئی مشکل آئی بھی تو بس وہی جو ایک نارمل آدمی کی زندگی میں آتی ہے۔
بہت مایوس شدہ آواز میں لڑکی نے کہا۔" انٹرویو تو آپ کا شائع ہوگا لیکن ہوگا نہایت مختصر۔"
انٹرویو تو میرا ناکامیاب رہا لیکن اُس دن مجھے یہ احساس ہوگیا کہ نارمل آدمی کے بارے میں نہ کوئی لکھنے کو تیار ہے اور نہ پڑھنے کو۔ اگر میں اپنے انٹرویو میں یہ کہتا کہ اسکول جانے کے لیے مجھے ایک دریا پار کرنا پڑتا تھا اور بستہ سر پر رکھ کر ٹھنڈے پانی میں تیرتے ہوئے میرے دل میں ایک ہی ولولہ ہوتا تھا کہ مجھے بڑا آدمی بننا ہے تو شاید میرا انٹرویو اتنا مختصر نہ ہوتا۔
اگر میں یہ کہتا کہ والد نے میری تخلیق پر مجھے اتنا پیٹا تھا کہ آج بھی میری پیٹھ پر ان زخموں کے نشان ہیں اور اگر اس سلسلے میں بچپن میں لگے ہوئے کسی مندمل زخم کا نشان ثبوت کے طور پر دکھا دیتا تو میرا انٹرویو اتنا مختصر نہ ہوتا۔
اگر میں کہتا کہ میرے گھر میں بجلی کا بل وقت پر جمع نہ کرانے کی وجہ سے جب بجلی کاٹ دی جاتی ہے تو میں سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے بیٹھ کر لکھتا ہوں تو میرا انٹرویو اتنا مختصر نہ ہوتا۔
آپ بھی اگر میری طرح نارمل آدمی ہیں تو آپ جانتے ہوں گے کہ ہم سب نے جوانی میں ایک آدھ عشق کیا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا کہ محبوبہ سے ملے۔ پارک میں بیٹھ کر اس کے ساتھ دس بارہ بار مونگ پھلیاں کھائیں۔ ریستورانوں میں بیٹھ کر چار چھ بار چائے پی اور جب محبوبہ کے والد نے شادی کی منظوری نہ دی تو ہم نے چپ چاپ اپنے والدین کے کہنے پر شادیاں کر لیں لیکن کسی وارث شاہ نے کیا کبھی دو سو

صفحے کی منظوم کتاب ہم پر لکھی۔ لیکن میاں رانجھے کی طرف دیکھیے بلکہ بھائی مجنوں کی طرف دیکھیے کہ کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا اور لیلےٰ کو ایسی جگہوں پر تلاش کرتا رہا جہاں اُس کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کون باپ اپنی جوان بیٹی کو تنہا جنگل بیاباں میں ٹہلنے کو بھیج دے گا تاکہ میاں مجنوں اُسے وہاں ڈھونڈ سکیں۔ مجنوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جو ایک نارمل انسان کرتا ہے بلکہ سب کچھ اس کے برعکس کیا۔ یعنی کپڑے پھاڑ لیے حالانکہ جنگل بیاباں میں اچھی خاصی سردی ہوتی ہے اور کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالوں میں خاک ڈال لی حالاں کہ صاف ستھرے بالوں کے ساتھ بھی اچھا خاصا عشق ممکن ہے۔ لیکن دیکھیے اس کا نتیجہ کہ آپ اور ہم جیسے عاشقوں کو کسی نے گھاس بھی نہیں ڈالی اور میاں مجنوں کتابوں پر کتابیں لکھوا گئے اپنے اوپر۔ مجھے تو کئی بار خیال آتا ہے کہ اگر لیلےٰ کے والد مجنوں سے مل کر کہتے کہ اگر تمھیں میری دختر نیک اختر سے محبت ہے تو بھائی روز نہایا کرو۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنا کرو۔ کوئی کام دھندا ڈھونڈ لو اور میں بخوشی لیلےٰ کو تجھ سے بیاہ دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میاں مجنوں غصے سے سرخ ہو کر کہتا کہ بڑے میاں جاؤ جاؤ اپنی راہ لو۔ میں اگر تمھاری بات مان لوں تو جناب میری تو داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔

شاید یہ بھید آپ بیتی لکھنے والے ادیب بھی جان چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ جس ادیب نے بھی اپنی آپ بیتی لکھی ہے اُس نے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اُس کے گھر کے لوگ شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں۔

ابھی حال میں مجھے ایک ادیب کی آپ بیتی سننے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے باپ کی تصویر کچھ اس انداز سے کھینچی تھی کہ میرے ذہن میں جو ہلاکو کا ایک دھندلا سا نقش ہے وہ تصویر ویسی ہی لگ رہی تھی جب وہ اپنی کتاب کا مسودہ مجھے پڑھ کر سنا رہا تھا اس وقت اس کا باپ بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے بزرگوار سے کہا۔

"آپ کا بیٹا جو کچھ کہہ رہا ہے، آپ کو برا لگ رہا ہو گا۔"

بزرگ نے وہسکی کا ایک بڑا سا گھونٹ لے کر کہا "شروع سے ہی اسے جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ بچپن میں وہ پٹتا بھی میرے ہاتھوں اسی عادت کی وجہ سے تھا۔"

دفتر میں میرا ایک ساتھی ہے جو اکثر مجھ سے شکایت کرتا ہے کہ میں اس کے بارے

میں کبھی نہیں لکھتا حالاں کہ اس میں ہزاروں خوبیاں ہیں۔ وہ وقت پر دفتر آتا ہے وقت پر دفتر سے جاتا ہے۔ کسی سے بدتمیزی نہیں کرتا۔ اپنا کام صحیح طرح سے کرتا ہے۔ بیوی بچوں سے محبت کرتا ہے۔ یار دوستوں کے کام آتا ہے میں نے جواب دیا۔ "یار تم نارمل آدمی ہو تم پر کوئی کیا لکھ سکتا ہے"۔

اس لیے اے قارئین کرام! اس بات کو گرہ میں باندھ لیجیے کہ جن لوگوں پر اخبارات میں ہر روز مضامین شائع ہوتے ہیں، جن کی زندگی پر کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ میری آپ کی طرح نارمل آدمی نہیں ہیں۔ اس لیے اگر آپ میرے مضامین یا ڈراموں کا موضوع بننا چاہتے ہیں تو کوئی الٹا سیدھا کام کیجیے بلکہ صحیح مشورہ یہ ہوگا کہ ڈھنگ سے کوئی الٹا کام کیجیے۔
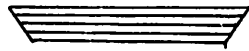
رنگ لائے گی ہماری پیش لفظی ایک دن

کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا اور کسی دولہا کا سہرا لکھنا تقریباً ایک جیسے کام ہیں۔ جیسے ہر شاعر سہرا نہیں لکھ سکتا، ایسے ہی کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا ہر ادیب کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جیسے کچھ شاعروں نے سہرا لکھنا اپنا پیشہ بنالیا ہے، اسی طرح کچھ ادیبوں نے پیش لفظ لکھنے میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ طنز و مزاح کی کتابوں کے پیش لفظ لکھنے میں سرفہرست میرے دوست مجتبیٰ حسین صاحب کا نام ہے۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو وہ اس سلطنت کے بلاشرکت غیر مالک ہیں۔ اگر میں طنز و مزاح کی کوئی کتاب دیکھتا ہوں جس میں مجتبیٰ حسین کی بجائے کسی اور کا پیش لفظ ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی سکھ کی شادی کوئی مسلمان مولوی کروا رہا ہو اور مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ بعد میں اس شادی کو تسلیم بھی کیا جائے گا یا نہیں۔

سہرا اور پیش لفظ میں بہت سی باتیں مشترکہ ہونے کے باوجود ایک بڑا فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ جوں جوں شاعر کا رتبہ شاعری میں بڑھتا جاتا ہے اُس کو سہرا لکھنے کو نہیں کہا جاتا۔ آپ کو یاد ہوگا بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیٹے شہزادہ جواں بخت کا سہرا غالب جیسے بڑے شاعر سے لکھوا کر ایک اچھی خاصی کنٹروورسی پیدا کرلی تھی۔ زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا تھا اِس لیے بات غالب کے معذرت نامے پر ٹل گئی۔ ایسی ہی کنٹروورسی آج کے دور میں ہوتی تو اس کو حل کرنے کے لیے دو تین کمیشن بیٹھ چکے ہوتے اور مسئلہ حل ہونے کی بجائے زیادہ الجھ چکا ہوتا۔

سہرے کے برعکس پیش لفظ ہمیشہ بڑے ادیب سے لکھوایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تو مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں لیکن اقبال کے اِس شعر میں ہلکا سا

اشارہ ضرور ملتا ہے ؎

سند تو لیجیے لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب رہیں رہیں یا نہ رہیں

سہرے اور پیش لفظ میں فرق تو صرف اتنا ہی ہے لیکن مشترکہ باتیں بہت سی ہیں۔ سہرا لکھنے والے کو دولھا میاں کی صورت میں وہ خوبیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں جن کا اس کے وجود میں نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ حسن مردانہ میں وہ یوسف ثانی ہے۔ شجاعت اس میں ٹیپو سلطان کی سی ہے۔ حوصلہ اس میں شیر ببر کا سا ہے اور تو اور اس کے ماتھے کے پسینے کو آبدار موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میرا سہرا پڑھا جا رہا تھا تو میں نے آئینہ منگوا کر دیکھا تھا کہ یہ تغیریات میرے جسم میں کب نمودار ہوئے۔ سہرے کے پھولوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ باغ ارم سے آئے ہیں اور خود پریاں انھیں لیکر آئی ہیں حالانکہ یہ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکڑ والے گل فروش سے خریدے گئے ہیں اور اُن کی قیمت ابھی چکانا باقی ہے۔ دولھا میاں کے ہر رشتہ دار کا نام لے لے کر کہا جاتا ہے کہ وہ سہرے پر سے قربان ہوا جا رہا ہے حالانکہ وہ سامنے بیٹھا جل بھن کر راکھ ہو رہا ہوتا ہے کہ اتنی بدشکل، ٹائروں کو پنکچر لگانے والے لڑکے کو دلھن کسی بیوقوف نے دے دی جب کہ میرا سرکاری دفتر میں کلرک لڑکا ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔

یہی سب کچھ پیش لفظ لکھنے والے کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کا کام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ سہرا سننے اور پڑھنے والے دولھا کے رشتہ دار اور یار دوست ہوتے ہیں اور سب کو پتا ہوتا ہے کہ سہرا نویسی میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے لیکن پیش لفظ لکھنے والوں کو خطرہ یہ درپیش رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اِس پیش لفظ کو مصنف اور اس کے رشتہ داروں کے علاوہ کوئی قاری بھی پڑھ لے۔ اس لیے کہنا تو اسے وہی پڑتا ہے جو سہرے میں کہا جاتا ہے لیکن کچھ اس طرح سے کہ اس پر سچ کا گمان ہو۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے اب تک اس آرٹ میں خوب مہارت حاصل کر لی ہے میں ان کے بہت سے پیش لفظ پڑھنے کے بعد اُن کی استادی کو کچھ کچھ سمجھ پایا ہوں۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا پیش لفظ ایک ایسے گواہ کے بیان کی طرح ہوتا ہے جو گھر سے طے کر کے نکلتا ہے کہ وہ ملزم کے حق میں بیان دے گا! ایسے گواہ پر آپ اگر کڑی نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب اُسے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھکر کہو کہ جو کچھ کہو گے سچ کہو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے تو وہ اپنا ہاتھ اِس چابکدستی کے ساتھ مقدس کتاب کی طرف لے جاتا ہے کہ کتاب میں اور اُس کے ہاتھ میں چھے اِنچ کا فاصلہ رہ جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا ہاتھ کتاب پر ہے، وہ جھوٹ کیسے بولے گا لیکن اُسے علم ہوتا ہے کہ کتاب اور اس کے ہاتھ میں کتنا فاصلہ ہے اور فاصلے کی وجہ سے وہ سچ میں جھوٹ کی کتنی آمیزش کر سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے پیش لفظ لکھنے کے جو اصول بنائے ہیں اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے کتاب پر بات کرنے سے پرہیز کرو۔ وہ اپنے پیش لفظ میں اصل مضمون کے علاوہ اور سب باتیں کریں گے اُن کا طریقہ اس عورت کا سا ہے جس سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں تو اُس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ چار ہیں بلکہ یوں کہا کہ اللہ کا فضل ہے یہ ایک طرح سے سوال کا جواب بھی تھا اور نہیں بھی۔ اللہ کے فضل کے حساب سے آپ بچوں کی تعداد دس بھی سمجھ سکتے ہیں اور دو بھی۔

دوسرا اصول اُن کا یہ ہے کہ ادیب میں جو خوبیاں ہیں ان کو گنواؤ، اس کے عیبوں کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ کرناٹک کے کسی دوکاندار سے اگر پوچھا جائے کہ اس کے پاس ماش کی دال ہے اور اس کے پاس اگر دال نہ بھی ہو تو وہ نفی میں کبھی جواب نہیں دیتا۔ آپ نے پوچھا "کیوں بھیّا ماش کی دال ہے"۔ وہ کہے گا "کالے چنے ہیں" آپ نے پوچھا "ہینگ کا پوڈر ہے"۔ اس کے پاس اگر نہیں ہے تو کہے گا کہ "پسا ہوا دھنیا ہے"، مجتبیٰ حسین صاحب اسی طرح کتاب کی کمیوں سے پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔

تیسرا اصول ان کا یہ ہے کہ صاحب کتاب کی کتاب پر تبصرہ کرنے کے بجائے وہ ادیب کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور تعلقات میں قاری کو اُلجھائے رکھتے ہیں۔ ان کی ملاقات کا میرے پاس ایک بڑا دلچسپ قصہ ہے ایک بار میں نے انھیں کہا کہ آپ نے فلاں صاحب کی کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے کہنے لگے ہرگز نہیں میں نے کہا میں نے

خود اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے کہنے لگے میں انھیں آج تک ملا ہی نہیں تو پیش لفظ کیسے لکھوں گا۔ میں نے جب کتاب نکال کر ان کے سامنے رکھ دی تو کہنے لگا کہ ہاں یاد آیا صاحبِ کتاب سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ اور وہ تب جب وہ اپنی کتاب پر پیش لفظ لکھوانے کے لیے میرے ہاں آئے تھے میں نے چند منٹ کے لیے ان سے ملاقات کی اور پھر پیش لفظ لکھ دیا۔

صاحب کتاب سے قریبی رشتہ داری نکالنے کے لیے مجتبیٰ حسین صاحب کو کن کن مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے یہ پڑھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ صاحب کتاب وہیں کے رہنے والے ہیں جہاں ایک مرتبہ میں چوتھی جماعت میں داخلہ لینے گیا تھا اس سے ثابت ہوا کہ میرے اور ان کے تعلقات بڑے پرانے ہیں۔ اِس رشتہ داری کو پڑھ کر مجھے ایک قصہ یاد آیا جو میرے والد صاحب سنایا کرتے تھے۔ میرے والد کسان تھے ایک دن اپنے کھیتوں کے پاس پیپل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ پاس کے گانو کا ایک چوہدری وہاں سے گذرا۔ گانو کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے والد نے اسے دعوت دی کہ وہ لسی پی کر جائے مسافر نے کہا کہ لسی تو پیوں گا ہی ساتھ میں کھانا بھی کھاؤں گا۔ والد نے کھانا منگانے کے لیے ایک ملازم کو گھر بھیجا اور مسافر سے پوچھا کہ کھانے کی فرمایش میں اِس قدر خود اعتمادی کی وجہ کیا ہے۔ مسافر کہنے لگا کہ میری آپ سے رشتہ داری ہے میرے گانو کی ایک گدھی بک کر آپ کے گانو میں آئی ہے۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور مل کر کھانا کھایا اس کے بعد مسافر نے وطیرہ سا بنا لیا کہ وہ جب کبھی ہمارے گانو کے راستے سے گذرتا، گدھی والی رشتہ داری کی بنا پر ڈٹ کر کھانا کھاتا اس طرح کوئی چھے مہینے گذر گئے۔ ایک بار مسافر آیا تو میرے والد نے اُسے لسی کے لیے بھی نہ پوچھا۔ مسافر نے حیران ہو کر کہا "کیوں سردار جی، آج کھانے کو نہیں کہہ رہے۔ وہ ہماری تمھاری رشتہ داری کیا ہوئی"۔ میرے والد نے جواب دیا۔ "چوہدری اب کیسی رشتہ داری اور کہاں کی رشتہ داری۔ وہ گدھی کل مر گئی ہے"۔

مجتبیٰ حسین صاحب کو میں نے ایک بار پوچھا کہ وہ پیش لفظ لکھنے کے لیے کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے جملے ڈھونڈ لیتے ہیں کہنے لگے صبح سیر کو جاتا ہوں تو پارک میں مکمل

تنہائی ہوتی ہے۔ موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ میں چلتا جاتا ہوں اور جملے اپنے آپ ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان پیش لفظوں میں مجتبیٰ حسین صاحب کی اچھی صحت کا راز مضمر ہے۔ انسان کوئی بھی کام کرے اس میں کچھ فائدہ تو ہونا ہی چاہیے۔

ایک بار میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ پیش لفظ آپ کو تو اچھی صحت بخشتے ہیں لیکن صاحب کتاب کو بھی ان سے کچھ فائدہ ہوتا ہے کیا؟ کہنے لگے کبھی کسی سہرا لکھنے والے سے پوچھیے اُس کے سہرے کی وجہ سے کبھی کسی دولہا کی ازدواجی زندگی خوشگوار بنی ہے کہیں۔ وہ کتنا بھی خوبصورت سہرا لکھے دولہامیاں کو شادی کا عذاب تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ میں تو پیش لفظ لکھ کر ادبی دولھوں کو ازدواجی زندگی میں دھکیل دیتا ہوں۔ آگے وہ جانیں اور اُن کی قسمت۔

ادب اور معاوضہ

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اپنا پہلا طنزیہ مضمون ۱۹۵۴ء میں لکھا تھا۔ یہ مضمون دلی کے ایک موقر رسالے میں شائع ہو گیا۔ شائع ہونے کے دس دن بعد میں اپنے مضمون کا معاوضہ لینے کے لیے رسالے کے دفتر میں جا پہنچا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو وہاں مدیر سمیت چھے سات آدمی موجود تھے۔ جونہی میں نے معاوضے کی درخواست کی دفتر میں موجود لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لگایا تو انہی سات آدمیوں نے لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس قہقہے میں ساٹھ ستر آدمی شامل ہوں۔ ہنسی جب ذرا تھمی تو مدیر محترم نے مجھے بتایا کہ اردو میں معاوضے کا رواج نہیں ہے۔ مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ رواجوں سے بھرپور اس دیش میں یہ رواج رائج ہونے سے کیسے رہ گیا۔ میں نے نہایت سادگی سے پوچھا کہ لوگ پھر لکھتے کیوں ہیں۔ کہنے لگے کہ شہرت کی خاطر۔

یوں تو مجھے شہرت حاصل کرنے سے کوئی شکایت نہ تھی لیکن اس سے زیادہ مجھے اُس وقت روٹی کی ضرورت تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا شہرت تو حاصل کروں۔ ہو سکتا ہے جب بہت مشہور ہو جاؤں تو لوگ روٹی بھی کھلانے لگیں۔ اتنا تو میں تب بھی جانتا تھا کہ امیر لوگ شہرت یافتہ لوگوں کو دسترخوان سجانے کے کام میں لاتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اس رسالے کے دفتر سے نیچے اُترا کہ شاید مجھے دیکھتے ہی قارئین کرام آنکھوں پر بٹھالیں۔ رسالہ جس میں میرا مضمون چھپا تھا میری بغل میں تھا۔ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا تو آنکھوں پر بٹھانا تو در کنار مجھے کوئی رکشا میں مفت بٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے ہر وہ حرکت کی جس سے لوگوں کو احساس ہو کہ میں ادیب ہوں لیکن کسی نے اثر قبول نہ کیا۔ مجبوراً مجھے باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ میں ادیب ہوں۔ جس کے

جواب میں کسی منچلے نے کہا کہ آپ جیسے سیکڑوں ادیب اس بازار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ میں جوتیاں چٹخاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

بعد میں میں نے غور و خوض کی تو پتا چلا کہ اردو کے رسائل کے پڑھے جانے کا یہ عالم ہے کہ اکثر انھیں وہی حضرات پڑھتے ہیں جو اُن میں لکھتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی اپنا مضمون پڑھنے کے بعد رسالہ سنبھال کر رکھ دیتے ہیں کیوں کہ زیادہ ورق گردانی کرنے سے رسالے کے پھٹ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اور ایسی حالت میں یہ سند نہیں رہتا اور بوقت ضرورت کام نہیں آتا۔

ادب کا مسئلہ کچھ اس طرح کا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس کا چسکا پڑ جاتا ہے اور چسکا تو آپ جانتے ہیں خطرناک عادت کا دوسرا نام ہے جس طرح عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر کسی بات کو چھپائے رکھیں تو ان کے پیٹ میں درد اٹھنا شروع ہو جاتا ہے ایسے ہی اگر کسی ادیب کے پاس لکھنے کو کچھ ہو اور وہ نہ لکھے تو اُس کے سارے جسم میں تناؤ سا آجاتا ہے۔ گردن اکڑ جاتی ہے۔ ماتھے کا رقبہ لگتا ہے کہ بڑھ گیا ہے۔ آنکھوں کی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ دیکھ بھی رہی ہوں تو لگتا ہے کہ نہیں دیکھ رہیں۔ ہاتھوں میں ایک عجیب سا رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ادیب چاہتا ہے کہ کسی طرح اِس مواد کو باہر نکالے جو اس کے اندر رینپ رہا ہے تاکہ جسم کے پرزوں میں پھر سے توازن آجائے۔ کچھ لوگ تو اس مواد کو باہر نکالنے کے لیے چائے یا شراب کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ جب یہ مواد باہر نکلتا ہے تو ادیب دوڑتا ہے لوگوں کو بتانے کے لیے کہ بھائی مواد باہر نکل آیا ہے۔

بتانے کی دو صورتیں ہیں ایک زبانی اور دوسرے تحریری۔ زبانی میں مشکل یہ ہے کہ سننے والے بڑے کائیاں ہو گئے ہیں بغیر چائے یا شربت پیے کوئی آج کل ایک شعر تک سننے کو تیار نہیں ہوتا ایک غزل کو سنانے میں کئی بار دو دو سو روپے نکل جاتے ہیں۔ افسانہ سنانا تو اور بھی مہنگا پڑتا ہے خاص طور پر اگر افسانہ تجریدی ہو تو خرچ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ سننے والوں کی توجہ خورد و نوش کی طرف اور بھی بڑھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب اپنی تخلیقات کی تشہیر کرنے کے لیے دوسرا طریقہ پسند کرتے ہیں جسے تحریری طریقہ کہتے ہیں یعنی مضمون

یا نظم کو کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اب آپ ہی بتائیے رسالے کا مدیر اسے معاوضہ کیوں دیگا جب اُسے پتا ہے کہ ادیب کے پاس چھپنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کیونکہ زبانی سننا کسی کو گوارہ ہی نہیں۔

میرے مضمون کو یہاں تک پڑھنے کے بعد شاید آپ کو خیال گزرا ہو کہ رسالوں کے مدیر ادیبوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں اُن کی تو کوٹھیاں بن رہی ہیں اور ادیب بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے حضور۔ اُن کی کوٹھیاں بن نہیں رہیں بک رہی ہیں۔ کسی کے والد بزرگوار کوئی مکان چھوڑ گئے اور مدیر صاحب نے اُسے رسالے پر لگا دیا۔ آپ کو شاید نظر نہ آئے لیکن مجھے تو رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اکثر مدیر محترم کی اہلیہ محترمہ کی بکی یا گروی رکھی ہوئی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے پریس کے مالکوں کے تقاضے اور اجرت مانگنے والے کاتبوں کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر صورت حال یہ ہے تو وہ رسالہ نکالتے کیوں ہیں۔ جیسے دور درشن اور ریڈیو پر ہم نے اکثر لوگوں کو کہتے سُنا ہے، آپ نے بہت ہی اچھا سوال کیا ہے۔ مختصر سا جواب تو اِس کا یہ ہے کہ جس طرح ادیب کو لکھنے کا چسکا پڑ جاتا ہے، ایسے ہی مدیر کو رسالہ نکالنے کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ وہ اگر رسالہ نہ نکالے تو اس کے جسم کے کل پرزوں میں وہی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جو ادیب کے مواد دبانے سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے شاعر اپنی غزل کے اوپر (یا کئی صورتوں میں کسی دوسرے کی غزل کے اوپر بھی) اپنا نام چھپا دیکھ کر ایک عجیب سی راحت محسوس کرتا ہے تقریباً وہی راحت مدیر رسالے کے اوپر اپنا نام دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب نے تو دو چار گھنٹے لگا کر مصرعے جوڑ دیے لیکن مدیر نے تو رسالے کے ورق جوڑنے میں بچوں کی روٹیاں داؤ پر لگا دیں۔

اگر رسالے بک رہا ہو تو مدیر محترم اپنے رسالے میں بار بار یہ اعلان کیوں شائع کریں کہ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اِس پسندیدہ رسالے کے لیے گاہک فراہم کریں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے چندہ لے کر ہمیں بھجوائیں۔ یہ اعلان پڑھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ میں ایک امیر گھر کی لڑکی ہوں جس کی شادی

ایک غریب سسر کے بیٹے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اب سسر صاحب مجھے بار بار مشورہ دیتے ہیں کہ بیٹی تیرا فرض بنتا ہے کہ تو اپنے رشتہ داروں میں جو امیر گھر کی لڑکیاں ہیں اُن کو پھانس کر میرے دوسرے بیٹوں کے لیے لا تاکہ ہمارے ہاں دال روٹی چلتی رہے۔

ایک ایسے ہی مدیر ایک بار مجھے ملنے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ مجھے کہنے لگے میں نے ایک رسالہ نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کا پانچ سال کا چندہ اس تھیلی میں ڈال دیں۔ میں نے کہا میں کیوں ڈالوں؟ کہنے لگے اِس لیے کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ میں نے خود آج صبح ہی اس تھیلی میں اپنے پانچ سو ڈالے ہیں میں نے کہا حضور یہ تو بالکل ایسے ہے کہ کوئی ڈاکو آکر مجھے کہے کہ بھائی گھر میں جو زیور اور نقدی ہے وہ میرے اس جھولے میں ڈال دو کیوں کہ میں نے خود اپنے زیور اور نقدی اس جھولے میں ڈال دی ہے۔

میں نے ایک بار اپنے ایک مدیر دوست سے پوچھا تھا کہ آپ لوگ رسالہ نکال کر گھر پھونک کر تماشا دیکھنے کا شغل کیوں اختیار کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ اور کوئی شغل ہمیں آتا نہیں تو کریں کیا؟

اُن کی بات سن کر مجھے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہمارے گانو کے پاس ایک کھلے میدان میں ایک فقیر کی برسی کے موقع پر ایک میلا لگا کرتا تھا جہاں علاقے کے تقریباً سارے مرد عورتیں اور بچے اکٹھے ہوتے تھے۔ جھولے لگائے جاتے تھے مٹھائیوں کی دکانیں سجتی تھیں جہاں جلیبیاں اور بوندی کے لڈو بکثرت بکتے تھے اس میلے میں طوائفیں گانے سنا کر اور بھانڈ تماشے دکھا کر لوگوں سے داد اور پیسے وصول کرتے تھے۔ بچے کھلونوں کی دکانوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اِس میلے میں میں نے اپنے گانو کے ایک بوڑھے بڑھئی کو دیکھا جو بوری میں اوزار ڈالے آواز لگا رہا تھا "چوہے پکڑنے کے پنجرے مرمت کروالو" میں نے اُس کے پاس جاکر پوچھا " بابا لوگ تو اس میلے میں عیش وعشرت کے لیے آئے ہیں۔ یہاں چوہے پکڑنے کا پنجرہ لے کر کون آیا ہوگا جو اُسے مرمت کروائے گا" وہ کہنے لگا بیٹا بات تو تمھاری ٹھیک ہے لیکن مجھے جو کام آتا ہے میں تو وہی کروں گا نا۔ اگرچہ ادیب بھی نے

کے ناتے مجھے مدیروں سے شکایت ہونی چاہیے کہ وہ مجھے میری تخلیقات کا معاوضہ نہیں دیتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ اب تک میں نے روٹی کمانے کے کئی اور آسان نسخے ڈھونڈ لیے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ میرا ادبی چسکا پورا کرنے میں میرا ساتھ دیے رہے ہیں البتہ ایک شکایت مجھے ہے اور وہ اس اعلان سے ہے جو وہ اکثر اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں جس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ادیبوں سے درخواست ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف خوش خط لکھا کریں۔ دو لائنوں کے بیچ خالی جگہ چھوڑا کریں۔ مضمون پہلے کہیں شائع شدہ نہیں ہونا چاہیے اگر مضمون ہمارے معیار پر پورا نہیں اترے گا تو واپس کر دیا جائے گا! اگر مضمون واپس چاہیے تو ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ساتھ بھیجیے وغیرہ۔ مفت کا سودا خریدنا اور اس پر اتنے نخرے! کئی بار مجھے خیال ہوا کہ ایسے مدیر کو ساتھ لے کر کسی ساڑھیوں کی دکان پر جاؤں اور وہاں ان سے یہ جملے کہلواؤں کہ صاحب مجھے اپنی بیوی کے لیے ساڑھی درکار ہے ساڑھی کا ڈیزائن ایسا ہونا چاہیے جو پہلے کسی نے پہنا نہ ہو۔ کپڑا مضبوط اور رنگ پکا ہونا چاہیے اگر میری بیوی کو ساڑھی پسند نہ آئی تو آپ کو اپنا آدمی بھیج کر جسے اسکوٹر، رکشا کا کرایہ آپ دیں گے، ساڑھی واپس منگوانی ہوگی اور ساڑھی پسند آجانے کی صورت میں اس کے دام ہرگز نہیں دوں گا۔ اس تقریر کے بعد میں دیکھنا چاہوں گا کہ دکان دار مدیر صاحب کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ میں اس سلوک کو اپنی ادبی تخلیقات کا معاوضہ سمجھ کر خوش ہو جاؤں گا۔